دو کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی

وں کہ تاریخ لکھنے کا کام کسی

صحیح النظر نقاد کے سپرد ہوا تو

ست میں سب

خان سالک

منگل"

حقائق و معارف

مولانا ظفر علی خاں

میری لائبریری لاہور ۸

میری لائبریری میں طنز و مزاح کی دوسری کتابیں

مصنف	کتاب	قیمت
شفیق الرحمن	لہریں	۱/۵۰
	پرواز	۱/۵۰
	حماقتیں	۳/۰۰
	مزید حماقتیں	۳/۰۰
کنہیا لال کپور	سنگ و خشت	۱/۵۰
	شیشہ و تیشہ	۱/۵۰
	چنگ و رباب	۱/۵۰
	گرد کارواں	۱/۵۰
	نرم گرم	۱/۵۰
	بال و پر	۱/۵۰
	نوک نشتر	۱/۵۰
اشفاق احمد خاں (لطیفے)	گرما گرم	۱/۵۰
شوکت محمود (کارٹون)	ڈھول کا پول	۱/۰۰
مشتاق احمد یوسفی	چراغ تلے	۱/۵۰
مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی	اردو کا بہترین طنز و مزاح	(زیر طبع)
"	اردو کا بہترین انشائی ادب	۴/۰۰
"	اردو میں شخصیت نگاری	(زیر طبع)
احمد جمال پاشا	اندیشۂ شہر	۲/۰۰

فہرس

کفر و ایمان کا جھگڑا

حسین بن منصور حلاج کے نظریات کی تشریح

عمرلیست کہ آوازۂ منصور کہن شد
من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را

(۱)

دُنیا کو ہدایت کی ضرورت تھی۔ صراطِ مستقیم دکھانے کی ضرورت تھی۔
بصیرۂ نیّرہ کی ضرورت تھی۔ رُشد و نور کی ضرورت تھی۔ رسُول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلّم مبعوث ہوئے۔ اور آنحضرتؐ نے کلام اللہ کی تبلیغ فرما کر سارے
زمانہ کی یہ ضرورت پوری کر دی۔ آسمان کا جو پیغام آپ نے زمین کو پہنچایا
وہ یہی قرآن تھا۔ جو اب بھی ہم میں موجود ہے۔ اور ہمارا "اِمامِ مبین" ہے
دُنیا کو وحی و الہام پر جس طریقہ سے چلایا۔ وہ اِسی سنتِ سنیہ کا مجموعہ تھا۔ جو
صحاح احادیث میں آج بھی مجتمع ہے۔ اور عہدِ رسالت کا تعامل اِس سے ظاہر ہوتا
ہے۔ فرزندانِ توحید کو استنباطِ مسائل کا جو منہاج بتایا۔ وُہ یہی فقہ ہے۔ جو
مجامیع فقہیات میں اس وقت بھی مدوّن ہے۔ اور عبادات و معاملات
وخصومات و احکام میں ایک شائستہ و مہذب و متمدن و پابند قانون زندگی
کی حدیں اِس سے جُدا جُدا نظر آتی ہیں۔

(۲)

حجرۂ نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ کے دروازے پر چند صحابہ حاضر تھے
اور آپس میں تقرب الی اللہ کے ذرائع پر گفتگو کر رہے تھے۔ کسی نے ترکِ طعام پر
زور دیا۔ کسی نے ترکِ راحت و آرام پر زور دیا۔ کہ شاید انہیں طریقوں سے خدا

مِل جائے۔ مکالمہ ہو ہی رہا تھا۔ کہ آنحضرت سلام اللہ علیہ حجرۂ مبارکہ سے باہر نکل آئے۔ اور صحابہ سے خطاب فرمایا۔ کہ میں سوتا بھی ہوں۔ جاگتا بھی ہوں کھانا بھی کھاتا ہوں۔ آرام بھی کرتا ہوں۔ اور پھر تم سب سے زیادہ مقرب بارگاہِ الٰہی ہوں
ایک مرتبہ سوال کیا گیا۔ کہ بہترین عبادت کونسی ہے۔ کہ خدا اُس سے خوشنود ہو۔ جواب مِلا۔ کہ ادائے فرائض بہ اعتدال و اخلاص و استقامت کہ بندوں کے حق میں اگر اس سے بہتر کوئی بات مناسب ہوتی۔ تو خدا اُسی کو فرض کیئے ہوتا ہے۔

حضرت ابو خثیمہ کہتے ہیں کہ خلافت راشدہ میں کچھ لوگ ایسے بھی پیدا ہو گئے تھے۔ جنہوں نے شاہ راہِ زُہد و تقویٰ پر چلنے کا ایک خاص طریقہ وضع کر لیا تھا۔ اُنہیں میں سے بعض افراد ایک مرتبہ مدینہ مشرفہ کے بازاروں میں سے گذر رہے تھے۔ اور اس حالت میں گذر رہے تھے۔ کہ بہت ہی آہستہ آہستہ آپس میں باتیں کرتے اور نہایت پھونک پھونک کے زمین پر قدم رکھتے۔ اہلِ مدینہ کے لِئے یہ بالکل نئی روش تھی۔ ایک صحابیہ کی جن کا نام حضرت شفاء بنت عبداللہ رضی اللہ عنہا تھا۔ اُن پر نظر پڑی۔ تو متعجب ہو کے پُوچھا۔ من ھٰؤلاء وما ھٰذا۔ یہ کون لوگ ہیں۔ اور کیا روش ہے؟ جواب مِلا نُسّاکٌ یہ ناسک ہیں۔ یعنی زاہد و عابد ہیں۔ صحابیہ نے کہا۔ کان واللہ عمر اذا تکلم اسمع واذا مشی اسرع واذا ضرب اوجع وھو واللہ ناسکٌ حقًا فاروقِ اعظم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جب باتیں کرتے تھے تو ایسے لہجہ میں باتیں کرتے تھے۔ کہ لوگ اچھی طرح سُن لیں۔ جب چلتے تھے۔ تو جلدی جلدی تیز چلتے تھے اور

جب مارتے تھے۔ تو دردانگیز مار مارتے تھے۔ با ایں ہمہ خدا کی قسم وہ حقیقت میں ناسک اور زہد والے تھے۔

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں اکثار فی العبادۃ کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ ایک بزرگ نظر پڑے۔ جنہیں کثرت عبادت و اغراق فی الزہد نے بالکل ہی نحیف و ضعیف کر دیا تھا۔ تاآں کہ اُن کی صورت محض ایک ہیولیٰ رہ گئی تھی۔ اشک پیہم نے آنکھیں خشک کر دی تھیں۔ اور حدقے تک دھنس گئے تھے۔ آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ کیفیت دیکھی۔ تو فرمایا کہ ان ھٰذا الدین متین فادخل فیہ برفق ان المنبت لا ارضاً قطع ولا ظھراً ابقیٰ۔ یہ دین متین ہے۔ اِس میں نرمی سے داخل ہو۔ جو تیز رفتاری کی دھن میں اپنے رفیقوں کو پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ اور منزلِ مقصود پر جلدی پہنچنے کے لیے بہ کمال سُرعت قدم بڑھاتا ہے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ نہ تو کچھ مسافت ہی اُس سے قطع ہوتی ہے۔ اور نہ جانور ہی اُس کی سواری میں زندہ بچتا ہے۔

(۳)

یہ ایمان تھا۔ اسلام تھا۔ احسان تھا۔ جس کی مکمل تعلیم ہم کو قرآن نے دی۔ حدیث نے اس کے جزئیات بتائے۔ اور فقہ نے اس کے لیے ضوابط بنائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی کو لے کر آئے تھے۔ آپ نے کوئی ایسی تعلیم نہیں دی۔ کوئی ایسی بات نہیں کی۔ جو شریعت کے علاوہ ہو۔ آپ کے آل و اصحاب بھی شریعت ہی کی تعلیم دیتے رہے اور شریعت ہی پر چلتے رہے۔

امیر المومنین علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ سے پوچھا گیا۔ کہ ظاہر شرع کے علاوہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے آپ کو کچھ اور بھی ملا ہے امیر المومنین نے جواب دیا کہ ماخصّنی اللہ بشیئ الا الفہم فی القرآن۔ اللہ تعالےٰ نے کوئی چیز مجھ سے مخصوص نہیں کی۔ جو سب کو ملا۔ وہی مجھے بھی ملا۔ جو سب کا اسلام ہے۔ وُہی میرا اسلام بھی ہے۔ بجز اِس کے کہ مجھے قرآن کے سمجھنے کا مادّہ اللہ تعالےٰ نے زیادہ عطا فرمایا ہے۔

بایں ہمہ مقتضیات روزگار نے ایک ایسا گروہ بھی پیدا کر دیا۔ جس نے شریعت کے علاوہ طریقت کی بھی ایک راہ نکال لی۔ ہم کو اس پر بھی کچھ ایسا اعتراض نہیں۔ آپ طریقت کے پیرو ہیں۔ شوق سے پیروی کیجئے لیکن شریعت کو نظر انداز نہ کر دیجئے۔ کہ ہم کو خود ایسے قدمائے صوفیہ کے حالات معلوم ہیں۔ جو شریعت کو سب پر مقدم رکھتے تھے۔ اور جن کی صوفیانہ زندگی ہم مسلمانوں کے لئے بھی موجب مباہات تھی۔ آپ اگر ویسے ہی صوفی ہو جائیں۔ ویسے ہی زاہد و عابد ہو جائیں۔ ویسے ہی سالک اور ناسک ہو جائیں۔ تو ہم میں آپ میں کوئی اختلاف نہیں۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ آپ نے چند مراسم کو تصوّف سمجھ رکھا ہے۔ چند مروّجات کو طریقت بنا لیا ہے۔ چند شطحیات پہ مدار کار ہے۔ مگر شریعت کہ اصل الاصول وہی تھے۔ سب سے فروتر رکھی گئی ہے۔ اور اُس کے مُقدس احکام کا امتثال تو درکنار جو خرقہ پوش منزہ جس قدر شریعت سے دُور اور خرافات سے قریب ہوگا اسی قدر وہ خاصانِ خدا میں زیادہ مرتبہ والا سمجھا جائے گا۔

(۴)

طریقت اگر منافی شریعت نہیں ہے تو ہم ان لوگوں کو دخیل فی الطریقت کہنے پر از روئے اسلام مجبور ہیں "جو کوئے جاناں سے خاک لاتے ہیں" اور "اپنا کعبہ الگ بناتے ہیں"۔ ایسے ہی افراد میں ایک صاحب حسین بن منصور حلاج بھی تھے۔ جنہیں عجمی تصوف کے شاعرانہ لٹریچر نے خدا بنا دیا ہے۔ اور اگرچہ حسب روایت صوفیہ۔ خود اُن کے عہد میں انہیں کسی نے بھی مقبول نہیں مانا ہے۔ اور سب ہی نے ان کو رد کیا ہے۔ مگر زوال تمدن عرب کے زمانہ میں وہی سر چڑھا لئے گئے۔ اور انہیں کو طریقت کا شیخ المشائخ مان لیا گیا۔ ان بزرگ کی تصنیفات کے نام اگرچہ علامہ ابن الندیم بغدادی کی کتاب الفہرست میں ہم نے پڑھے تھے۔ مگر دُنیا نے یہ بات مان لی تھی۔ کہ فتنہ تاتار نے اُن کی ساری کتابیں ضائع کر دیں۔ اور سارے نسخے ناپید ہو گئے۔ دیار اسلام یا اقطاع مغرب میں کہیں بھی حسین بن منصور حلاج کی۔ یا شہرت عامہ کے اتباع میں یوں کہیئے کہ منصور حلاج کی کوئی کتاب موجود نہ تھی۔ اِس لئے ہم اِن کی نسبت رائے قائم کرنے میں اسی قدر قلیل ذخیرہ یسیرہ کی معلومات پر کفایت و قناعت کرنے کیلئے مجبور تھے۔ جو مؤرخین عرب نے اپنی مشہور تاریخوں میں یا صوفیوں نے اپنے مولفات و ملفوظات میں فراہم کی ہیں۔

لیکن خدا بھلا کرے دانایانِ فرنگ کے ذوقِ علمی کا کہ اس پُر آشوب زمانہ میں بھی ان کا شوق تحقیق کم نہ ہُوا۔ اور اُن کی طلب صادق خاص منصور کی ایک تصنیف کردہ عربی کتاب سے زمانہ کو روشناس کرنے میں کامیاب ہوئی

گئی۔

اِس قدیم اور نادرہ روزگار تصنیف کو فرانس کے ایک نہایت نادر مستشرق نے شائع کیا ہے۔ جو خدا کے فضل سے اس وقت ہمارے پاس بھی موجود ہے۔ اور ہم کل سے اس پر تبصرہ کا سلسلہ شروع کر دینگے جس سے آپ اندازہ کر سکیں گے۔ کہ منصور کا تصوف کیا تھا۔ اور وہ کس درجہ بخطِ مستقیم اسلام کے مخالف واقع ہوا ہے۔ حیف ہے کہ منصور کا یہی غیر اسلامی تصوف ہمارے آج کل کے صوفیوں میں رائج ہے۔ اور ان بزرگوں نے اِسی متاعِ ناسرہ کو نغز و درست سمجھ رکھا ہے۔ اور اتنا بھی نہیں جانتے کہ جس زندقہ کے وُہ شیدائی ہیں۔ وُہ الحاد فی الدین ہے۔ کفر باللہ ہے۔ استہزا بالقرآن ہے تصوف کو اور اصلی تصوف کو اِس سے کچھ سروکار نہیں۔ طریقت اِس سے بیزار ہے۔ اور حقیقت کو اِس کے انتساب سے ہزار در ہزار ننگ و عار ہے۔

(۵)

کوئی صُوفی کسی عقیدہ کا ہو۔ لیکن وہ اِس حقیقت سے انکار کرنے کی ہرگز جرأت نہیں کر سکتا۔ کہ اصلی تصوف کیا ہے۔ جس چیز کی اصلیت کا اندازہ کرنا ہو۔ تو اُس کے ایام نشر و نشور و تکوین کی کتابوں سے اِس کا اندازہ کیجیئے کہ اقرب الی الصواب یہی طریق ہے۔ اس اصل الاصول کے مطابق آپ کو طریقت کی حقیقت دریافت کرنی ہو۔ تو قدمائے صوفیہ ہیں جو مانے ہوئے صدور ائمہ و رؤس آئمہ ہیں۔ ان کی کتابوں سے اِس حقیقت کو

دریافت کیجئے حضرت یحییٰ معاذ رازی قدس اللہ سرہٗ کی کتاب الفقر والغنی
پڑھئے۔ حضرت امام قشیری کا رسالہ پڑھئے۔ حضرت شیخ عبدالرحمٰن السلمی کی
طبقات الصوفیہ پڑھئے۔ حضرت شیخ شہاب الدین سُہروردی کی عوارف المعارف
پڑھئے اور پھر دیکھئے۔ کہ یہ وہ کتابیں ہیں جن کی نسبت ہم کو رائے
زنی کی تو ضرورت نہیں۔ البتہ صوفیوں کے خیال میں یہ ہر ایک زمانہ میں
جانِ تصوف و روح روانِ طریقت مانی گئی ہیں۔ مگر منصور کی کتاب
زیرِ نظر اُن سے کس قدر مختلف واقع ہوئی ہے۔

منصور کا تصوف آپ کو ایک ایسی راہ پر لے جاتا ہے۔ جو کم از کم قرآن
کی راہ تو نہیں ہے۔ یا اگر کسی فاقد البصیرۃ کی نظر میں قرآن کا احترام نہ ہو کیتب
صوفیہ ہی کا احترام ہو جب بھی کہہ سکتے ہیں۔ کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی
طاب ثراہ نے اپنی کتابوں کے ذریعہ سے تصوف کی جو راہ دکھائی ہے
منصور کا سنگلاخ راستہ اِس منہاج سے بالکل ہی الگ تھلگ واقع
ہُوا ہے پھر بھی آپ اِس بیٹر کو پسند کرتے ہیں۔ اور اِس جادۂ سو یہ
کو آنکھ اُٹھا کے بھی نہیں دیکھتے۔

انصاف کیجئے۔ آپ دُنیا جہان کو مشعلِ ہدایت دکھانے چلے تھے کہ اہلِ
شریعت تو ظاہر پرست ہیں۔ باطن کی معرفت آپ ہی کے لئے مخصوص ہے
ہم مانتے ہیں کہ اہلِ شریعت نے سچ مچ اپنی صُورت بگاڑ لی۔ اور ہم اس پر
سالہا سال سے زارنالی کرتے چلے آئے ہیں۔ لیکن شمع بزمِ طریقت ہو کر
جب خود آپ بھی گم کردہ راہ ہو گئے ہوں۔ تو جو لوگ آپ پر کتاب و سنت پیش

کرتے ہوں۔ آپ کو قرآن و حدیث کی دعوت دیتے ہوں۔ آپ کو اُن سے مکابرہ کرنا چاہئے۔ ان سے بر سرِ پرخاش ہونا چاہئے۔ انہیں دشنام دینی چاہئے۔ اُن کی بات سُن لینی چاہئے۔ اَور اس پر عمل کرنا چاہئے۔

(۶)

شریعت ہی کا قانون ہے۔ جس کی پابندی اہلِ حق پر فرض ہے اور جناب باری نے اپنے بندوں کو صدق و حقیقت کے اس فرض بزرگ کے علاوہ اور کسی امر کے لئے مکلّف نہیں بنایا۔ کائنات میں جسقدر سچائیاں ہیں۔ سب اِسی قانونِ شریعت کے اندر موجود ہیں۔ رُوحِ انسانی ارتقا کے انتہائی معارج طے کرنے کے بعد راحتِ ابدی و عیشِ جاودانی کی جس معراج پر فائز ہو سکتی ہے وُہ اسی قانون کا صدقہ ہے۔ اِس کے علاوہ نہ کوئی اور قانون ہے نہ کوئی اور ضابطہ۔ اِس کے مقابلہ میں اگر کسی اَور دستور، کسی اَور آئین، کسی اَور کلیہ، کسی اَور جزئیہ کو پیش کیا جاسکے۔ تو وُہ درحقیقت اسی کا تابع ہے۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس قانونِ اعظم کو پُوری شرح و بسط کے ساتھ کھول کھول کر بتا دیا ہے۔ لیکن ہم اِس شرح میں نہ تو کہیں یہ لکھا ہُوا پاتے ہیں کہ روحِ انسانی آفرینشِ عالم سے پہلے بھی موجُود تھی۔ یا ذاتِ باری کے جوہر میں سے اُس کا خروج ہُوا تھا۔ ہم کو یہ بات بھی کہیں نظر نہیں آئی کہ باری تعالیٰ کی حیثیت ذاتاً وصفاتاً بہ لحاظ خالق ہونے کے مخلوقات سے کچھ جُدا نہیں ہے بلکہ وہ ہر ایک چیز کی عین ہے اور کائنات کے ذرہ ذرہ میں وہ اِسی طرح ساری و طاری ہے۔ جس طرح بُو گلاب میں ہو۔ یا کیف شراب میں۔ اِس

دقیق نکتہ پر بھی ہماری کہیں نظر نہیں پڑی۔ کہ روح انسانی اپنے مبدءِ اصلی یعنی ذات باری سے جدا ہو کر ۳۵ ہزار نورانی پردوں کو چاک کرتی ہوئی اور ۳۵ ہزار ظلمانی حجابات کو چیرتی ہوئی اس دنیائے دُوں میں آتی ہے اور جب تک یہاں رہتی ہے۔ اس کی غایت الغایات بجز اس کے اور کچھ نہیں ہوتی۔ کہ کسی طرح تنزلات کے چکر میں سے نکل جائے۔ اور بطریق صعود ان ستر ہزار پردوں کو اٹھا کر اس قطرہ کی طرح جو بالآخر سمندر میں جا ملتا ہو۔ پھر خدا کے نور میں جا کر جذب ہو جائے۔ اور دنیا و عقبیٰ حشر و نشر جزاء و سزا، جنت و دوزخ ان سب تصورات کو قرآن کریم کی لفاظی سمجھ کر اپنی جداگانہ ہستی کو مٹاتی ہوئی خدا کی ہستی میں شامل ہو جائے۔ کہ دراصل وہ خود بھی خدا ہی کا ایک جزو تھی۔ جو تھوڑی دیر کے لئے اس سے جدا ہو گئی تھی۔ ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے قانون میں کہیں یہ قول بھی دکھائی نہیں دیتا کہ روح انسانی کائنات کی روح اعظم یعنی ذات باری میں ضم اگر ہو سکتی ہے تو محض بواسطۂ تواجد و رقص کہ ناچتے ناچتے حال آ گیا اور روح صاحبہ پکار اٹھیں۔ کہ پا لیا۔ پا لیا۔ میں ہی خدا ہوں۔ اور ان صاحبہ کی سہیلیاں جو اس رقص والہانہ کے قطار رنگیوں میں شریک تھیں۔ پکار اٹھیں کہ صَلِّ وَجَلِّ حقیقت یہ ہے کہ تمام باتیں جنہیں تصوف نے حقیقت کا عطیہ قرار دے کر شریعت کے علی الرغم اسلام کے سر منڈھنا چاہا ہے۔ اسلام کو ان سے کچھ تعلق نہیں۔ اور اسلام میں ان کا نشان تک نہیں پایا جاتا اور اسلام کو حق ہے کہ اگر یونانی اور ویدانتی فلسفے کے ان شطحیات کو اس سے منسوب کیا

جائے۔ تو وُہ جوش میں آ کر کہے کہ سبحانک ھذا بھتان عظیم"۔

(۷)

مسیحی تصوّف کے پیرِ طریقت سینٹ آگسٹائن جنہیں کلیسائی عیسوی قطب الاقطاب مانتا ہے۔ اپنے اُس اندازِ تحریر میں جس کی اُلجھنوں نے صدہا مسیحی مفسروں سے بڑی بڑی مطوّل شرحوں کا خراج وصول کیا ہے حسبِ ذیل پُراسرار نکتہ صوفیانہ ارشاد فرماتے ہیں:۔

"اِنسان حقیقت میں خُود وہی ہے۔ جو اُس کا محبوب ہو"۔

مسیحی کتاب المحبّت والشوق کے اس دیباچہ کی شرح مشہور مغربی صُوفی بزُرگ ایکہارٹ نے اِس طرح کی ہے:۔

"اگر اِنسان پتھر سے لو لگائے گا۔ تو پتھر ہو جائیگا۔ اِنسان سے عشق کریگا تو اِنسان ہو جائیگا۔ خدا کی محبّت کے نشہ میں سرشار ہو گا تو......لیکن مجھے مجال نہیں کہ اِس سے آگے کچھ کہوں۔ اِس لئے کہ اگر ایک کلمہ بھی میرے مُنہ سے نِکلا جس نے حقیقت کو ظاہر کر دیا۔ اور میں نے کہہ دیا کہ اِنسان خُدا کے عِشق کے نشے میں چُور ہو کر خُدا ہو جائیگا۔ تو آپ لوگ مجھے سنگسار کر دیں گے"۔

اس پر مغرب کے مشہور مستشرق پروفیسر نِکلسن جن کی ایک عمر تصوّف اور اُس کی چھان بین میں بسر ہوئی ہے۔ کیا خوب فرماتے ہیں:۔

"یہ تو مسیحی صُوفی تھے۔ جن کی زبان پر قرونِ متوسط کے کلیسائی ڈومن کیتھولک نے جبر کی مُہر لگا رکھی تھی۔ اور اُن کو اجازت نہ تھی کہ اپنے دل کی بات علی الاعلان کہہ دیں۔ لیکن دُنیائے اسلام میں آزادیٔ تقریر و تحریر زیادہ

تھی بمسلمان صوفیوں کو حق حاصل تھا۔ کہ جو جی میں آئے کہہ دیں۔ اور اگر اُن کے اقوال شریعت کے آداب سے متجاوز ہو جاتے تھے۔ اور وہ حد سے بڑھ جاتے تھے تو وہ عموماً اس ترشے ہوئے غدر کی آڑ میں پناہ لے لیا کرتے تھے۔ کہ ہم اس وقت عالم بیخودی میں ہیں۔ ہم پر سُکر کی حالت طاری ہے۔ ہمیں حال آگیا تھا۔ ہم صراط صحیحہ سے بہک گئے تھے۔ اور اس لئے مرفوع التخلیم تھے۔ ہمارے لئے حرام بھی حلال تھا۔ اِس عذر کو اُمتِ مسلمہ واجبی قرار دینے کی خوگر ہو گئی تھی یہاں تک کہ جلال الدین رُومی تک اِسی عذر کو اپنی سپر بنا کر کہہ اُٹھے کہ اے میرے نفسِ مطمئنہ اگر میں کہوں کہ تو ہی خدا ہے۔ تو مجھے کافر قرار نہ دے"۔ اور اس قول کی شرح یہ کہہ کے کردی۔ کہ تم لوگ خدا کو ڈھونڈتے ہو۔ تمہاری جستجو عبث ہے۔ کیونکہ خدا تو خود تمہیں ہو۔

پروفیسر نکلسن کا خیال بالکل صحیح ہے کہ مسلمانوں نے اِن بزرگوں کو جنہیں حقیقت شناسی کا ادعا تھا۔ اور جنہوں نے تصوف کی آڑ میں ہر ان کہی بات کہی ہے۔ ہمیشہ اس بنا پر روا دارانہ سلوک کا مستحق خیال کیا ہے۔ کہ اِن حضرات کے ناگفتنی اقوال اُن کے بے معنی دعاوی اور مجذوبانہ خود فراموشی کے شاخسانے تھے۔ اور ایسی حالت میں ان سے کوئی باز پرس نہ ہونی چاہئے۔

بے چارہ مسلمان حقیقت میں ایک نہایت ہی بھولی بھالی ہستی ہے اور مصالحت تو اس کی گھٹی میں پڑی ہے۔ یہ دُنیا کے چھل فریب اور بٹے بازیوں کو کیا جانے ہر ادنیٰ درجہ کا عطائی اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اس کو غلط فہمی میں مبتلا کرسکتا ہے اِسلام کا واسطہ بنا کر ہر کافر و کفر اس کو رام کرسکتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کا نام لے کر ہر گبر زند باف اس کے کعبہ کو آتش کدہ بنا سکتا ہے۔

کہ ترک سادۂ ما با فقیہاں بر نمی آید

لیکن اسلام کے پاس سادہ لوح فرزند کو کبھی بھولے سے بھی یہ خیال آیا کہ اگر خود فراموش صوفی کی حالت سکر رہی حقیقت کی آئینہ دار ہے تو پھر یہ کیا ماجرا ہے۔ کہ بے خود ہو کر اسکی زبان پر "انا الحق" کا نعرۂ مستانہ تو جاری ہو جاتا ہے۔ لیکن قل ھو اللہ احد کی آسمانی آواز ستر ہزار پردوں کی فضاؤں کے اندر بھی گونجتے نہیں پاتی۔ وہ ناچ ناچ کر اور تھرک تھرک کر اور بھاؤ بتا بتا کر یہ تو کہنے لگتا ہے کہ میں ہی خدا ہوں لیکن اس کے جھوٹے منہ سے آج تک اس عالم بیہوشی میں جسے عین ہوش کہا جاتا ہے۔ یہ فقرے نہ نکلے۔ ھو اللہ الذی لا الہ الا ھو الملک القدوس السلام المومن المھیمن العزیز الجبار المتکبر۔

شاید یہ کہا جائیگا۔ کہ یہ باتیں قال والوں کے لئے ہیں۔ قرآن خوانی بادپیمائی ہے۔ بادہ نوشوں کو اس سے کیا سروکار؟

لاکھوں مسلمان اس فقرہ میں آیا کئے ہیں۔ اور امت مرحومہ کے ان گنت نفوس کے ایمان کا آئینہ اسی زنگ سے آلودہ ہوتا چلا آیا ہے لیکن کچھ خدا کے بندے ایسے بھی ہیں جن پر یہ افسوں نہیں چلا۔ اور انشاء اللہ تعالے نہ چلیگا۔ منصور حلاج جس نے یہ افسوں شاید دنیائے اسلام میں سب سے زائد پھونکا ہے کتاب الطواسین کے اندر اپنے اصل رنگ میں نظر آتا ہے اور اسی طومار خرافات پر نظر ڈالنا ہمارا مقصود ہے۔

یہ کتاب الطواسین موسیو بے سگنان نے شائع کی ہے۔ اصل عربی کیساتھ

ساتھ فارسی ترجمہ بھی ہے۔ اور پھر فرانسیسی زبان میں اس پر ایک نہایت مبسوط مقدمہ و تبصرہ ہے۔ جو اگرچہ بہت ہی دلآویز و دلکش تحقیقات سے لبریز ہے۔ مگر سردست ہم اس سے بھی قطع نظر کرتے ہیں۔ کہ سب سے پہلے منصور کے معتقدات و تصوف پر ہم کو روشنی ڈالنی ہے۔ اور خود منصور ہی کی عبارت سے اس متن کی شرح کرنی ہے دستراہ غداً۔ وان غداً لناظرہ قریب۔

(۸)

فلسفۂ آفرینش مسئلہ آفرینش کائنات کی لِم فلسفیوں نے تو یہ بتائی ہے کہ اوّل اوّل بجز ایک ہیولائی مادّے کے غیر متناہی تودے کے اور کچھ نہ تھا جس کے اجزائے لاینجزی میں جذب و دفع۔ اصوق و پیوستگی۔ جمود و حرکت۔ برودت و حرارت۔ لطافت و کثافت۔ بالیدگی دکاہیدگی۔ رتق و فتق کی متضاد مگر لازم و ملزوم قوتیں موجود تھیں۔ اپنے وقت پر یہ قوتیں بروئے کار آئیں اور مادۂ ہیولائیہ اصلیہ صورت پذیر ہو کر عوالم و شموس و اقمار و ثوابت و نجوم و معیار کے نظامات کی شکل میں نمودار ہو گیا۔ اور ان گنت زمانوں کے گذرنے کے بعد اس کی ہیئت کذائیہ یہ ہو گئی جو اب نظر آتی ہے۔

قرآن کی شہادت فلسفہ کے ان حقائق عمومی پر وہ امّ الکتاب بھی جس پر ہمارا ایمان ہے کم از کم ایک آیت نیرہ سے روشنی ڈالتی ہے۔ سورۃ الانبیاء میں ہے:۔

اولم یرا الذین کفروا ان السموات والارض کانتا رتقا ففتقنٰھما وجعلنا من الماء کل شیئ حی افلا یومنون ۵

یعنی وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے جو ناسپاس و ناشکر گذار ہیں۔ جو خدا کی خدائی کو نہیں مانتے۔ کیا وہ یہ نہیں دیکھتے۔ کیا انہیں اس پر غور کرنے کی فرصت نہیں ہے۔ کہ آسمان اور زمین یہ سب ایک وقت میں ایک ہی تھے۔ ایک گول دائرہ جیسے تھے۔ جنہیں ہم نے جُدا جُدا کر دیا۔ اور ہر چیز کو ہم ہی نے پانی کی کیفیت سے زندگانی بخشی۔ کیا اس پر بھی وہ ایمان نہیں لاتے ؟

اتحاد صوفیہ تکوین عالم کا ایک تو یہ فلسفہ ہے۔ جس کی شہادت ہمیں نہ صرف آج کل کی ترقی یافتہ درایت بلکہ خود اپنی مقدس دیرینہ روایت حتیٰ کہ قرآن کی آیت سے ملتی ہے۔ لیکن حضرات متصوفین کے لیئے علوم جدیدہ اور معارف قرآنیہ کافی نہیں۔ انہوں نے ایک نیا فلسفہ ایجاد کیا ہے۔ اور زمین و آسمان۔ آفتاب و ماہتاب۔ حجر و شجر۔ اور حیوان و بشر کی آفرینش کی ایک انوکھی وجہ تصنیف کی ہے۔ جسے چند لفظوں میں اُس مشہور جملہ کے ذریعہ سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ کہ بطریق معتاد اُسے جناب باری کے مُنہ سے نسبت دے دی گئی۔

کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق

یعنی خدا فرماتا ہے کہ میں ایک گنج مستور تھا۔ ایک پوشیدہ خزانہ تھا میرا جی چاہا کہ میری معرفت عام ہو۔ میں روشناس ہو جاؤں۔ اس بناء پر میں نے مخلوق کو پیدا کیا ؂

ادائے معشوقانہ اُس ذوق خود آرائی کی عنصری مثال کو پیش نظر رکھ کر جو کسی عروس خود بین کو آئینہ کے سامنے گھنٹوں اپنے ہی جمال کے نظارہ پر مجبور کیا کرتا ہے ان بزرگواروں نے خدا کو بھی ایک معشوق سمجھ لیا ہے۔ جس نے اپنے حسن لایزالی کو خود اپنی آنکھوں دیکھنے کیلئے یہ کائنات بنائی۔ جو گویا ایک آئینہ ہے۔ کہ اُس میں اُسے اپنی صورت نظر آ رہی ہے غرض دُنیا کیا ہے۔ اچھا خاصہ بچوں کا کھیل ہے۔ بھان متی کا تماشا ہے۔ پتلیوں کا ناچ ہے۔ نظریۂ آفرینش کائنات کے یہ صُوفی پروفیسر قرآن مجید کو کھول کر دیکھتے۔ اور سورۃ الانبیاء کی تلاوت کرتے۔ اور ان آیات پر غور کرنے کی انہیں توفیق عطا ہوتی وما خلقنا السماء والارض وما بینهما لاعبین لو اردنا ان نتخذ لهواً لاتخذ ناه من لدنا ان کنا فاعلین بل نقذف بالحق علی الباطل فید مغه فاذا هو زاهق ولکم الویل مما تصفون۔

(ہم نے آسمان کو۔ زمین کو۔ آسمان و زمین کی درمیانی خلقت کو کھیل تماشے کے لئے نہیں پیدا کیا ہے۔ اگر ہم لہو و لعب ہی کرنا چاہتے۔ تو وہ کچھ کرتے جو ہماری قدرت و عظمت کے شایان شان ہوتا۔ جو ہم کو زیب دیتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم باطل کے سر پر حق کو دے مارتے ہیں دونوں کو ٹکرا دیتے ہیں۔ حق اسے چکنا چور کر دیتا ہے۔ پاش پاش کر ڈالتا ہے۔ اور وہ یک بیک مٹتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور تم پر عذاب ہو۔ تم کیسی توصیف کر رہے ہو۔ کیسی کیفیت بیان کرتے ہو۔

اِن آیات کریمہ سے صاف نظر آتا ہے کہ کائنات کو جناب

باری نے کس لئے پیدا کیا ہے۔ اور اس پیدائش میں اُس نے کیا حکمت رکھی ہے۔ یہ حکمت دو لفظوں میں بیان کر دی گئی ہے۔ کہ دُنیا حق و باطل کی رزمگاہ ہے۔ لیکن منصوفین حق و باطل کی جاں کاہ بحث کو چھوڑ کر لہو و لعب کی زیادہ تر دلکش داستان چھیڑ دیتے ہیں۔ اور ہمیں یقین دلانا چاہتے ہیں کہ:۔

حُسن بے پردہ خریدارِ متاعِ جلوہ ہے
آئینہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے

خُدا اِنسان اَور اِنسان خُدا ہے

منصُور حلاج اس بازی گرانہ فلسفہ کا ایک بہت بڑا شارح ہے۔ وہ اپنی کتاب میں کہتا ہے کہ اِنسان کا جوہر خُدا ہے۔ خُدا نے آدم کو اپنی صُورت پر پیدا کیا۔ آدم اُس کے ازلی و ابدی عشق کی تصویر ہے۔ اپنی ذات سے اُس نے اِس تصویر کا عکس ڈالا۔ کہ یہ عکس اُس کیلئے بمنزلہ ایک آئینہ کے ہو۔ اور اس آئینہ میں وُہ اپنی صُورت دیکھا کرے۔ یہی وجہ تھی۔ کہ اُس نے فرشتوں کو آدم کی پرستش کا حکم دیا۔ کہ آدم اور مسیح دونوں میں وہ متجسم ہو کر دُنیا میں رُونما ہُوا۔ چنانچہ منصُور کا قول ہے:۔

"پاک ہے وہ ذات جس نے اپنی انسانیت (آدم) کی وساطت سے اپنی شانِ ربوبیت کا راز آشکارا کیا۔ اور اس کے بعد وُہ اپنی مخلوقات کے سامنے بصورتِ ظاہر اُس شخص (مسیح) کی شکل میں نمایاں ہُوا جو کھاتا بھی تھا۔ اور پیتا بھی تھا۔"

انسانیت اور ربوبیت کے لئے منصور نے ناسوت اور لاہوت کی اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ اور اُس کے جن تجسیمی و حلولی معتقدات کو آپ نے اقتباس بالا میں ملاحظہ فرمایا ہے۔ وُہ اُس کے اس نکتہ کی شرح ہیں۔ کہ ازبس کہ خدا کا ناسوت انسان کی کل بدنی اور روحانی فطرت کو شامل ہے لہٰذا خدا کا لاہوت اس فطرت کے ساتھ صرف بطریق تجسیم یا علیٰ سبیل حلول ہی متحد ہو سکتا ہے۔

خدا اور انسان کو اس طور پر مشترک فی الذات والصفات ثابت کر کے منصور کو جہ انا الحق کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ اور کہتا ہے:۔

"تیری رُوح میری رُوح میں اسی طرح گھل مل گئی ہے
جس طرح شراب میں آب مصفٰے"

"جب کوئی چیز تجھے چھوتی ہے۔ تو وہ مجھے بھی چھوتی ہے
اے خدا ہر حال میں تو وُہ ہے جو میں ہوں"

"میں وُہی خدا ہوں جو میرا محبوب ہے، اور وُہ جو میرا محبوب ہے۔ وہ خود میں ہوں۔ ہم دو روحیں ہیں۔ جو ایک ہی جسم میں ہیں"

"اے کہ تو مجھے دیکھتا ہے۔ جان لے کہ تو اُس کو بھی دیکھتا ہے۔ اور اگر تو اس کو دیکھتا ہے۔ تو یقین مان۔ کہ تو ہم دونوں کو دیکھتا ہے"

ظاہر ہے۔ کہ مسلمان ان مشرکانہ عقائد سے سخت بیزار ہیں اور منصور کے یہ عقائد اُس کے قتل کے بعد اُس کے مُریدوں کی طرف ایک خاص جماعت

کا دستور العمل بنے رہے۔ لیکن حکومت کے مقابلہ میں اس کی مظلومی اس کے آڑے آگئی۔ اور آنے والی اسلامی نسلوں نے شاعروں اور صوفیوں کی مدد سے اُس کی تعلیم پر پردہ ڈالنے اور اُسے طریقت کا شیخ الشیوخ ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ سأریکم اٰیاتی فلا تستعجلون۔

(۹)

حسین بن منصور حلّاج کے تصوف کی حیثیات اصلیہ خود اُنہیں کی تصنیف (کتاب الطواسین) میں نظر آتی ہے۔ قرآن حکیم ابلیس کو ملعون کہتا ہے۔ خدا اُس کو مردود کرتا ہے۔ اسلام اُسے خبث و شر کی صورت مثالیہ مانتا ہے۔ مگر منصور کا تصوف اِسی ابلیس کے مناقب و محامد میں رطب اللسان ہے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار میں ایسے ایسے دلائل پیش کرتا ہے جس سے صاف مترشح ہوتا ہے۔ کہ ابلیس اِس انکار میں برسرِ حق تھا۔ اور شریعت برسرِ باطل ہے۔

شیطان کے فضائل

منصور نے اپنی کتاب میں "طاسین الازل والالتباس" کا جو عنوان قائم کیا ہے۔ اِس میں دعویٰ کیا ہے کہ ما کان فی اھل السّماء موحّدٌ مثل ابلیس۔ یعنی آسمان والوں میں ابلیس جیسا موحد کوئی دُوسرا نہ تھا۔ اس دعویٰ کی دلیل میں لکھا ہے:۔

لُعِنَ (ابلیس) حین وصل الی التفرید فقال لہ اسجد قال لا غیر قال لہ وان علیک لعنتی الیٰ یوم الدین قال لا غیر ما لی الیٰ غیرک سبیلٌ وانی

محبٌّ ذلیلٌ قال لہٗ استکبرت قال لوکان لی معک لحظۃً لکان یلیق بی التکبر والتجبر وانا الذی عرفتک فی الازل انا خیر منہ لانی من قدمٍ ولہ لی قدمۃ فی الخدمۃ لیس فی الکونین اعرف منی بک ؂

اِس عبارت کا خلاصہ حسب ذیل ہے :-

ابلیس اُس وقت ملعون ہُوا۔جب تفرید کے درجہ تک پہنچا (مرتبہ تفرید بھی تصوّف ہی کا ایک مرتبہ ہے) اللہ تعالےٰ نے اُس سے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کے لئے حکم دیا۔شیطان نے کہا "تیرے سوا کوئی دوسرا تو موجود ہی نہیں" اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ تجھ پر میری لعنت تا بہ روز قیامت" شیطان نے پھر یہی کہا۔کہ "تیرے سوا کوئی دوسرا تو موجود ہی نہیں.... دُوسروں سے میری راہ ورسم ہی نہیں۔میں صرف تیرا ہی چاہنے والا ہُوں" اللہ تعالےٰ نے فرمایا۔کہ "تو نے استکبار اختیار کرلیا ہے۔شیطان نے جواب دیا کہ "تیری معیت میں اگر ایک ہی لحظہ مجھے گذرا ہوتا۔جب بھی تکبّر وجباری میرے مناسب حال تھی۔کہ تجھ ایسے معبودِ حقیقی کی معیت نصیب ہو چکی ہے۔پھر اس نعمت سے شرفیاب ہوتے ہُوئے میرا مدِّ مقابل دوسرا کون ہو سکتا ہے۔مگر واقعہ یہ ہے کہ ایک لحظہ کیا چیز ہے۔میں نے تو تجھ کو ازل ہی میں پہچان لیا تھا۔اور تیری معرفت مجھے حاصل ہو گئی تھی میں آدم سے بہتر ہوں۔اس لئے کہ میں تیرا قدیم الخدمت ہوں۔اور مجھ سے زیادہ تیری ذات وصفات کا عارف دونوں جہان میں کوئی نہیں ؂

حضرت موسیٰ اور شیطان کی ملاقات

اسی سین الذل ہیں جناب منصور نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ شیطان کی ملاقات کا تذکرہ بھی کیا ہے اور ترک سجود کی ذیل میں اُس کی توحید پرستی کی تکریم و تمجید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

التقی موسیٰ و ابلیس من عقبۃ الطور فقال لہٗ یا ابلیس ما منعک عن السجود- قال منعنی الدعوی بمعبود واحدٍ و اسجدت لہٗ لکنت مثلک فانک نودیت مرۃً واحدۃً انظر الی الجبل فنظرت ونودیت الف مرۃ لاسجد ولکن ما سجدت الدعوی فقال اللہ ترکت الامر- قال یا موسیٰ ھٰذا التغیر الظاھر والحال لا محول علیہ فانہ یحول لکن المعرفۃ صحیحۃ کما کانت وما تغیروان الشخص قد تغیر- فقال موسیٰ الان تذکرہ فقال یا موسیٰ الفکرۃ لاتذکر- اما مذکور وھو مذکور ذکرہ ذکری و ذکری ذکرہ ان عذبنی بنارہ ابد الابد ما سجدت لاحدٍ ولا اوّل لشخص وجسدٍ ولا اعرف ضداً دعوی دعوی الصادقین وانا فی الحب من الصادقین ؎

یعنی کوہِ طور کی گھاٹی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات ابلیس سے ہوئی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا- کہ "شیطان! تجھے سجدہ کرنے سے کس چیز نے باز رکھا تھا؟ اُس نے کہا- کہ مجھے سجدہ کرنے سے اس چیز نے باز رکھا تھا- کہ میں ایک ہی معبود کی بندگی کا دعویدار تھا- اگر میں آدم کو سجدہ

کئے ہوتا۔ تو امتثال امر میں میری حالت بھی تیری ہی جیسی ہوتی۔ صرف ایک مرتبہ تجھ کو آواز دی گئی۔ کہ پہاڑ کی طرف دیکھ۔ اور تو نے دیکھ لیا۔ مگر مجھ کو ہزار مرتبہ آواز دی گئی۔ کہ میں آدم کو سجدہ کروں۔ پھر بھی میں نے اپنے دعویٰ کی بنا پر سجدہ نہ کیا۔" حضرت موسیٰ نے کہا۔ "تو نے خدا کے حکم کی بجا آوری چھوڑ دی۔" ابلیس نے کہا۔ "یہ حکم نہ تھا۔ یہ آزمائش تھی۔" حضرت موسیٰ نے کہا۔ "آخر تیری صورت تو خدا نے متغیر کر دی۔" اُس نے جواب دیا کہ "یہ ظاہری تغیر ہے۔ حالات پر انحصار نہیں۔ کیونکہ حالات تو بدلتے رہتے ہیں۔ اصل چیز خدا کی معرفت ہے جو بدستور صحیح و ثابت و راسخ ہے۔ جیسے پہلے تھی۔ ویسے ہی اب بھی ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔" حضرت موسیٰ نے کہا۔ "اب بھی تو خدا کو یاد کرتا ہے کہ نہیں۔" اُس نے کہا۔ "فکر و خیال کو یاد میں نہیں لاتے میری بھی یاد کی جاتی ہے۔ اور خدا کی بھی یاد کی جاتی ہے۔ خدا کی یاد میری یاد ہے اور میری یاد خدا کی یاد ہے۔ ...... اگر وہ مجھے عذاب جاوید سے معذب کرے۔ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دوزخ میں ڈالے رکھے۔ تب بھی اُس کے علاوہ میں کسی دوسرے کو سجدہ نہ کرونگا۔ نہ کسی شخص کیلئے ذلیل ہونگا نہ کسی کے جسم کے لئے ذلت اختیار کرونگا۔ اور نہ میں یہ جانتا پہچانتا ہوں کہ خدا کی ضد بھی کوئی موجود ہے۔ کہ اُس کو سجدہ کیا جائے۔ میرا دعویٰ راست بازوں کا دعویٰ ہے۔ اور میں خدا کی اُلفت و عشق میں راست باز ہوں۔"

عبرت و بصیرت | ہم آگے دکھائیں گے۔ کہ منصور نے صاف لفظوں میں شیطان کی تقدیس کی ہے۔ اور اُس کے دعویٰ

کو دُرست مانتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے نتائج پر نظر ڈالتے ہیں جو طاسین الازل کی عبارات مذکورہ سے نکلتے ہیں :۔

(۱) شیطان اُس وقت ملعون و مردود ہوا۔ جب تصوف کے درجۂ تفرید میں وہ پہنچا ہے۔

(۲) شیطان کی توحید پرستی کی عجیب شان تھی۔ کہ سب کچھ ہوا۔ مگر اُس نے معبود برحق کے سوا کسی کو سجدہ نہ کیا۔

(۳) شیطان فخرِ موجودات تھا۔ اس لئے کہ اُسے روزِ ازل سے معرفتِ الٰہی حاصل تھی۔

(۴) حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا جو حکم شیطان کو ملا تھا۔ وہ حکم نہ تھا۔ ابتلا تھا۔

(۵) باوجود ملعون ہونے کے معرفت ذات باری میں کوئی کمی نہیں آئی۔ شیطان اب بھی بہترین عارف باللہ ہے۔

(۶) شیطان کی یاد اور خدا کی یاد دونوں ایک ہیں۔

(۷) شیطان اپنے دعویٰ عشق و محبت الٰہی میں سچا ہے۔"

یہ نتائج ہیں۔ جن میں سے کسی ایک کا انکار بھی منصور نے نہیں کیا ہے بلکہ جیسا کہ آگے چل کر آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔ اِن سب میں شیطان کی ستائش کی ہے۔ پھر کیا یہ تصوف قرآن و حدیث کے منافی و مغائر نہیں ہے۔ اور کیا آپ علم و اسلام سے اسی تصوف کے اجلال و اکرام کے متوقع ہیں۔ ربنا اھدنا الصراط المستقیم۔ صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین۔

سلسلۂ ادبیاتِ اسلام

(۱)

کتنے ہی سودا ہیں۔ جو سر میں سمائے ہیں۔ کتنی ہی آرزوئیں ہیں جن کا دل میں ہجوم ہے۔ کتنی ہی تمنائیں ہیں۔ جو مرزا غالب کی آہوں کیطرح سینہ میں پے بہ پے اٹھتی ہیں۔ اور "بخیہ چاک گریباں" بن جاتی ہیں۔ لیکن دل کو کیا کیا جائے۔ کہ ایک ہی ہے:۔

یک دل و خیل آرزو دل بہ کجا کجا دہم

جی چاہتا ہے کہ قرآن مجید اور اُس کے معارف و حقائق کے نشر و اعلا کے لئے زندگی کو وقف کر دیا جائے۔ اور بصیرت افروز اہتمام کیساتھ کلام اللہ کا نسخہ لاکھوں کی تعداد میں چھپوا کر ہدیۂ دنیائے اسلام کیا جائے۔ جس کی آیات کا شمارہ ساتھ ساتھ درج ہو۔ جس کے معانی و مطالب و لغات کی کلید بھی ساتھ ہی شامل ہو تاکہ ایک لفظ یا اُس کے مادے کے مستحضر ہوتے ہی مقام مطلوب پیش نظر ہو جائے اور ساتھ ہی آیات ربانی کا اردو ترجمہ اسکی محققانہ تفسیر کے ہمراہ شائع کیا جائے:۔

جی چاہتا ہے کہ احادیث حضور سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ایک جامع نسخہ جو صحاحِ ستہ اور دوسرے مصنفات و مسانید و مجامیع کا عصارہ ہو۔ ایک نئے انداز کی تفصیل و تبویب کے ساتھ مطالب احادیث کی فہرست ابجدی و عمومی کے تکملہ کے ہمراہ شائع کر کے نہ صرف آج کل کے انگریزی خواں طبقہ بلکہ جمہور مسلمانانِ ہند کی ایک شدید ضرورت پوری کی جائے۔

جی چاہتا ہے کہ اسلام کی ایک سیزدہ صد سالہ عقلی تاریخ لکھ کر دنیا کو بتایا جائے۔ کہ اس حقیقتِ کبریٰ نے جس کی تجلیاں اول اول فاران کی چوٹیوں پر لمعہ ریز ہوئی تھیں۔ دنیا میں دانش و حکمت اور معارف و حقائق کے کیسے کیسے لمعات وانوار بصیرت کی آنکھوں میں بکھیرے ہیں:۔

جی چاہتا ہے کہ یورپ نے دنیائے اسلام کی محیرالعقول ترقیوں پر جو استشراقی روشنی ڈالی ہے۔ اس کے اقتباسات اہلِ نظر کے پیشکش کئے جائیں۔ اور اُن کو بتایا جائے۔ کہ جو کام آپ کے کرنے کا تھا۔ وُہ دُوسرے کر رہے ہیں۔

یہ اور اسی قسم کی بہت سی خواہشیں ہیں جو رہ رہ کر ہمارے دِل میں پیدا ہوتی ہیں۔ اور کون مسلمان ایسا ہوگا۔ جو انہیں باتوں کا خواہشمند نہ ہو:۔

کیا وہ وقت آگیا ہے۔ کہ یہ آرزوئیں پوری ہو جائیں۔ اور اُردو ان تمام حقائق کے دریا بہا کر دُنیا کی بڑی بڑی زبانوں کے اُن سمندروں سے جا ملے جن

کے تبحر کی گود میں علم وفن اور حکمت وتحقیق کے ہزاروں لؤلؤ شاہوار پرورش پا رہے ہیں:۔

یقیناً وُہ وقت آگیا ہے۔ اور ہمارے اس یقین کی شہادت حیدر آباد دکن کی جامعہ عثمانیہ کا شعبہ تراجم وتالیفات دے سکے گا۔ یہ عظیم الشان کام اصل میں اعلیٰ حضرت نظام الملک آصف جاہ سابع شہریار دکن ہی کی ہمت بلند کو زیب بھی دیتا ہے۔ اور خدا کرے جامعۂ عثمانیہ اپنے فرض سے باحسن الوجوہ عہدہ برا ہو سکے:۔

ہماری بے مائیگی سے اِتنا بھی بہت ہے۔ کہ روزنامۂ ستارہ صُبح کے ذریعہ سے تاریخ وادب اسلام کے وُہی سلسلے قائم ہو سکیں۔ اور جن کو اِس سمندر کی ضرورت ہے۔ اُنہیں لب تر کرنے کو ایک دریا بار قطرہ ہی میسّر آسکے:۔

پہلا سلسلہ جس کا عنوان ہم نے "سلسلۂ تاریخ اِسلام" تجویز کیا ہے خدا کا نام لے کر آج شروع کر دیا گیا ہے۔ دُوسرا سلسلہ یہی "سلسلۂ ادبیات اسلام" ہے کہ اِس کی ذیل میں آپ کبھی عرب کے موتی بکھرے ہوئے دیکھیں گے۔ اور کبھی عجم کے جواہر زواہر آپ کی نگاہ کو خیرہ کرینگے۔ کبھی ہندوستان کا لطیف تزین تخیل مائدہ سخن کا نمکدان بنا ہؤا نظر آئے گا۔ کبھی اِن جنون انگیز پھولوں کی بوباس سے آپ کا مشامِ جاں معطر ہو گا۔ جو مشاطۂ اسلام نے اسپین وپرتگال وسارڈینیا واطالیہ وروس وبلغاریہ میں گُوندھے تھے۔

دُعا کیجئے۔ کہ خُدائے بزرگ وبرتر ہمارے ہاتھ میں گُریز قلم دے۔

قلم میں بہار آفرین قدرت دے۔ اور اس قدرت کے خزانے آپ کے سر نثار کرے۔ رب اشرح لی صدری ویسّر لی امری واحلل عقدۃ من لسانی یفقھو قولی انک کنت بنا بصیرا

عرب

دورِ جاہلیت

عرب جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے ساتھ ہی کائنات کی وادیوں میں علم و حکمت کے دریا بہا دیئے۔ مائدۂ ادب پر الوانِ نعمت کے بوقلموں خوان لگا دیئے۔ ذوقِ سلیم کی محفل میں معارف لطیفہ کی آفتاب نما شمع جلا دی۔ اپنی کانِ طینت کے اندر پہلے بھی بہت سے ناتراشیدہ الماس۔ بہت سے اَن گھڑ جواہرات رکھتا تھا۔ اور ادبیاتِ عرب کی کوئی تاریخ کامل و مکمل نہیں ہو سکتی۔ جب تک اُن جواہر پاروں پر تبصرہ کی روشنی نہ ڈالی جائے۔ جو عروسِ جاہلیت کے گلے کا ہار ہیں۔

ظہورِ اسلام سے پہلے عرب میں فنِ کتابت الشاذ کالمعدوم کا حکم رکھتا تھا۔ اور دماغ انسانی کے وہ افکار جن کی بداعت اور شگفتگی کو بقاء پر کچھ حق تھا۔ سفینوں کی بجائے سینوں میں محفوظ رہتے تھے۔ کتاب کا کام اُس غیر معمولی قوتِ حافظہ سے لیا جاتا تھا۔ جس کے محیر العقول کارناموں نے صدہا سال کے مظلم دھندلکے کو خاورستان بنا رکھا تھا۔ اِس قدیم عہد میں نثر کا تو رواج نہ تھا۔ کہ وہ ارتقائے ادب کے مراتب اُخرمی سے تعلق

رکھتی ہے۔ اور عرب کے بادیہ نشینوں نے ابھی تمدن میں اتنی ترقی نہ کی تھی۔ خیموں کے اندر الاؤ کے اُجالے اعراب بادیہ قصہ کہانیوں سے البتہ شغل رکھتے تھے۔ اور اُن کا ناثرانہ کمال داستان گوئی تک محدود تھا۔ لیکن یہ طویل و عریض داستانیں خواہ کیسی ہی رنگین اور دلآویز کیوں نہ ہوں راویوں کی زبانی سلسلہ درسلسلہ ہم تک نہ پہنچ سکتی تھیں۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی نظری نہیں ہوسکتی۔ کہ عرب جاہلیت سے کسی قدر کلام منثور بھی ماثور ہے۔ جس کی صرف چار صورتیں ہیں:۔

(۱) امثال۔ یعنی مختلف قسم کے واقعات پیش آنے پر جو مثلیں کہی گئیں کہ آجتک فصاحت و ایجاز کی جان سمجھی جاتی ہیں۔ امثال عرب کے مجموعے متعدد کتابوں میں مجتمع ہیں۔ جن میں زیادہ مشہور و مستند علامہ میدانی کی کتاب الامثال ہے۔ جس میں چھ ہزار سے زیادہ ضرب الامثال کا ذخیرہ فراہم ہے:۔

(۲) حکم۔ یعنی وہ حکیمانہ کلام معقول جو حشو و زوائد سے پاک اور حق و صدق کا آئینہ دار ہوتا تھا۔ عرب جاہلیت ایسے جوامع الکلم کے لئے شہرہ آفاق تھے۔ جن کتابوں میں اُن کی حکمتیں جمع کی گئی ہیں۔ اُن سب کے نام بھی "جوامع الکلم" ہی ہیں:۔

(۳) خطب۔ یعنی جنگ و حملہ و مہم دوخدو فخر و نزاع و مصیبت کے موقع پر جو تقریریں ہوتی تھیں۔ یا درباروں میں یا مجمع عام میں جو خطبے دیئے جاتے تھے۔ اُن کے اکثر نمونے مبرد کی کتاب الکامل میں موجود ہیں

(۴) وصایا۔ یعنی خاص قسم کی تقریریں جو ایک مخصوص جماعت اور ایک مقصد مختص کے لئے ہوتی تھیں۔ ابن عبدربہ نے اس کے نمونے بھی دیئے ہیں:۔

بااین ہمہ نثر جاہلیت کے یہ نمونے کچھ ایسے بہت نہیں ہیں۔ اور نہ بالاستیعاب ان کی حفاظت ہی ممکن تھی:۔

نظم البتہ ایک ایسی چیز ہے۔ جو اوزان و ترتیب الفاظ ترنم نما سانچے میں ڈھل کر ہر کہ ومہ کی زبان پر بے اختیار جاری ہو جاتی ہے۔ اسی سے دل پسند اشعار کا دماغ میں محفوظ ہو جانا ایک قدرتی بات ہے اور جاہلیت کے کلام کا جو بہت بڑا حصہ جوں کا توں تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے اس کا باعث دماغ انسانی کا یہی تدریجی ارتقا ہے:۔

جاہلیت کے عالی پایہ تخیل نے ہمارے لئے وہ مشہور و معروف قصائد ترکہ میں چھوڑے ہیں۔ جنہیں سبع معلقات کہا جاتا ہے ان یادگار زمانہ قصائد کی ترتیب و تالیف و تدوین کا شرف مورخین کی رائے میں بالاجماع جس شخص کو حاصل ہے۔ اس کا نام حماد راویہ ہے اور بے جا نہ ہوگا۔ اگر ہم اس مقام پر اس کے مختصر حالات سے اپنے ناظرین کرام کی ضیافت طبع کا سامان بہم پہنچائیں:۔

حماد راویہ

آٹھویں صدی عیسوی کے نصف اول کا زمانہ تھا۔ اور بنی امیہ سریر آرائے سلطنت اسلامیہ تھے۔ اسی سطوت اندوز عہد میں جبکہ شعر و شاعری کے گھر گھر چرچے تھے۔ ایک نہایت ہی

حیرت انگیز دل ودماغ کا شخص حمّاد بن سابور راویہ اسلام کی گود میں پرورش پا رہا تھا۔ جو "حماد الراویہ" کے لقب سے ممتاز ہے۔ اور یہ لقب اُسے اِس لئے دیا گیا ہے کہ قوت حافظہ میں اُس عہد کا کوئی شخص اُس کا جواب نہ تھا قدیم شعرائے عرب کے ہزاروں ہی اشعار اُس کی نوک زبان تھے۔ اور کلام جاہلیت کے بیسیوں قصائد اُسے تمام وکمال ازبر تھے۔

علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں۔ کہ ایک مرتبہ حمّاد نے یزید بن عبدالملک اموی سے کہا۔ کہ میں حروف تہجی کے ہر حرف پر سو طویل قصائد جن کے قوافی ایک ہی حرف پر ٹوٹتے ہوں۔ فقط شعرائے جاہلیت کے کلام سے سنا سکتا ہوں۔ اور چھوٹی چھوٹی نظموں کا تو شمار ہی نہیں۔ یزید سمجھا کہ حمّاد محض تعلّی وخودسرائی سے کام لے رہا ہے۔ اِس لئے اُس نے اُس کے دعویٰ کی تصدیق کرنی چاہی۔ خود بیٹھ گیا کہ حمّاد کے دعویٰ کا جھوٹ سچ معلوم ہو جائے اس ایک نشست میں حمّاد راویہ نے دو ہزار نو سو قصائد جو سب کے سب زمانۂ جاہلیت کے شعرا کے نتائج افکار تھے پڑھ کر سنائے۔ اور ولید سے ایک لاکھ درم انعام پایا۔

حمّاد عجمی نژاد تھا۔ اُس کا باپ شاہ پور جو جنگ میں گرفتار ہوا تھا دیلمیوں کی اس مشہور نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ جس میں گیلان کے کوہستانیوں نے مدتوں عربوں کا مقابلہ کر کے اپنی حریت قائم رکھی تھی۔ اور بالآخر آل بویہ کے نام سے خلافت کے اقتدارات کو اس حد تک سلب کر لیا تھا۔ کہ بغداد میں خلیفۂ اسلام کا عہدہ محض ایک روحانی منصب رہ گیا تھا۔

حمّاد اگرچہ کوفہ میں پیدا ہوا تھا۔ لیکن اُس کی عجمی اصلیت پر اُس کا عدیم النظیر علم وفضل اور اُس کی بے مثال زبان دانی پردہ انداز ہوئی۔ اس لیے کہ بعض دفعہ وہ ایک آدھ جملہ محاورۂ عرب کے خلاف ایسا کہہ جاتا تھا۔ جس پر زبان دانانِ عرب داجبی نکتہ چینی کیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔

اِس عرصہ میں حکومت بدل چکی تھی۔ ہشام مسندِ سلطنت پر متمکن تھا اور اس کے پیشرو نے حمّاد کے ساتھ جو سلوک کیا تھا۔ اس کی وجہ سے حمّاد اس کی آنکھوں میں کھٹکنے لگا تھا۔ اور یہ کھٹک بے وجہ نہ تھی۔ یزید جیسے تاجدار کے لیے جس نے اپنی عمر رنگ رلیاں منانے میں بسر کی ہو۔ اور حج کی نیت سے مکہ پہنچ کر پہلا ہی کام یہ کیا ہو کہ مکہ کے سب سے بڑے مغنی یحییٰ المقلب بالفیل کو دعوت غنا وسرود دی ہو۔ گو ایک نشست کی قصیدہ خوانی کے صلہ میں بیت المال اسلامی میں سے ایک لاکھ درم اُٹھا کر دے دینا جائز ہو سکتا تھا۔ لیکن ہشام کی پاسداری اسلام اور حفاظتِ حقوق امتِ مسلمہ ایسے لغو اسراف کو کیوں کر جائز رکھ سکتی تھی۔ بہر حال ہشام کا عتاب زیادہ دیرپا نہ تھا اور کچھ دنوں کے بعد حماد دمشق بلا لیا گیا۔

تاریخ بھی ایک عجیب نیرنگ نواز حقیقت ہے۔ ایک شخص شام تک چور اور اُٹھائی گیرا تھا۔ صبح کو جو اُٹھا۔ تو اچھا خاصہ ادیب اور شاعر بن گیا۔ حمّاد کی زندگی اسی نرالی حقیقت کی تصویر ہے۔ پہلے اس کا پیشہ چوری تھا۔ لوگوں کو دم جھانسے دیکر اُن کا مال ہتیا لینا۔ راہ چلتے کی آنکھ میں خاک جھونک کر اس کی جیب کتر لینا۔ اس کا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ لیکن ایک دن جب آدھی

رات کے وقت اُس نے ایک شخص کو لُوٹا۔ اَور اس کی جیب میں اشرفیوں اور روپوں کے ساتھ ایک نظم بھی پائی۔ تو حمّاد کی زندگی ہی بدل گئی۔ نظم کیا پڑھی خود بھی ناظم ہو گیا۔ اَور شعر و ادب کے اِتنے گنجِ شائگاں دن رات کی دیدہ ریزیوں اور جگر کاویوں سے فراہم کِئے کہ دُنیا میں ایک زِندہ دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) کے نام سے مشہور ہو گیا۔

حماد کی وفات بروایت بعض ۱۶۶ھ میں اَور بروایت بعض ۱۶۴ھ میں ہوئی ؞

ضرب المثل

عمر بھر کے مشاہدے اَور تجربے کو زِندگی کی کسی حقیقت کے متعلق مافی الدل چند صاف و سادہ الفاظ میں بلاغت کیساتھ جمع کر دینے کا نام ضرب المثل ہے۔ اور اِس فن میں اُسی شخص کو دستگاہ کامل حاصل ہو سکتی ہے جس کا تجربہ نہایت طویل ہو۔ مشاہدہ نہایت عمیق ہو۔ نظر نہایت وسیع ہو۔ اور اِن صفات سہ گانہ کے ساتھ کلام پر قدرت اور تخیل میں بلندی ہو۔ عربوں کو ابتداء ہی سے باوجود لِکھے پڑھے نہ ہونے کے حکیمانہ تکلّم کی اس صنف میں ایک امتیاز خاص حاصل تھا۔ شعر تو وُہ ایسا کہتے ہی تھے جو سننے والے کے دل میں بجلی کی سی تڑپ پیدا کر دیتا۔ اَور اس کے جذبات میں اپنی کیفیت نوعی کے لحاظ سے شدید ہیجان لے آتا۔ لیکن بارہا ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک شخص کے مُنہ سے ایک جملہ نِکلا ہے۔ اور قوم کی زبان پر جاری ہو گیا ہے۔ اَور یہی نہیں کہ صحرا کے اُس غنچۂ نو دمیدہ کی طرح جو آفتاب کے نقطۂ

نصف النہار تک پہنچتے پہنچتے مرجھا جاتا ہو۔ یہ قول بھی کچھ دن زبان زدِ خلائق رہ کر حوالۂ نسیان و فراموشی ہو جاتا ہو۔ بلکہ کئی نسلوں کے گذر جانے پر بھی دانش و فرزانگی کے اس سکّہ کا چلن ویسا ہی معتبر رہتا تھا۔ جیسا اول اوّل اعرابی نطق اور عدنانی فصاحت کی ٹکسال سے ڈھل کر نکلنے کے بعد۔

صدیاں گذر گئیں۔ زمانے بیت گئے۔ جاہلیت کا دور پرانا افسانہ ہو گیا۔ لیکن اس عہد کی ضرب المثلیں ابھی تک محفوظ چلی آتی ہیں اور اُس کے تمدن پر روشنی ڈال رہی ہیں۔ جاہلیت کے کلام منظوم پر نظرِ انتقاد ڈالنے سے قبل ہم چند امثال پیش کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ یہ تاریخی سلسلہ جو باوجود طویل الذیل ہونے کے بے حد ایجاز و اختصار کا پہلو لیے ہوئے ہو گا۔ تشنہ نہ رہ جائے:۔

مثل کی ایک جامع و مانع تعریف ژرف نگاہانِ عرب نے اِن الفاظ میں کی ہے:۔ المثل عبارۃ عن تالیف لا حقیقت لہٗ فی ظاھرہ قد ضمن باطنہ الحکم الشافیۃ۔

(مثل ایک ایسی تالیف کا نام ہے جس کی ظاہر میں تو کوئی حقیقت نہ ہو۔ مگر باطن میں شفابخش حکمتوں پر مشتمل ہو) پھر اس مثل کی تین قسمیں کی ہیں۔ اوّل مفترضۂ ممکنہ۔ دوم مخترعۂ مستحیلہ۔ سوم مختلطہ۔

(۱) قسم اوّل میں یہ التزام ہے کہ جس بات یا جس کام کا اس سے تعلق ہو۔ وہ کسی ذی عقل سے منسوب کیا جائے:۔

قسمِ ثانی کا لازمہ ہے۔ کہ اُس میں جو باتیں کہی جائیں۔ وہ حیوانات و جمادات کی زبان سے کہی جائیں جن سے انسان کی ہدایت مقصود ہو۔

قسمِ ثالث میں جو باتیں ہوتی ہیں۔ وہ ناطق و غیر ناطق کے درمیان ہوتی ہیں۔

مثل کے لیئے چار شرطیں ہیں :۔

(۱) اس میں کوئی ایسی تعقید نہ ہو۔ جو سننے والے کے ذہن میں انتشار پیدا کر سکے :۔

(۲) طویل اور ملال انگیز نہ ہو :۔

(۳) سامع اِس کی تازگی و طراوت سے خوش ہو جائے۔ ہزل کی بات سن کر اچھوتے مطالب سے آگاہ ہو کر اُن فکاہات سے خیال میں تشحیذ پیدا ہو۔ بنائی ہوئی بات سے عقل میں انضباط آئے۔ اور مشکل حل ہو جائے۔

(۴) مثل کی صورت ایسی ہو۔ جس میں کئی احتمال پیدا ہوتے ہوں۔

مثل کی اِن تینوں قسموں اور چار شرطوں کے چند نظائر عنوانِ ذیل کے تحت ملاحظہ فرمائیے :۔

"اِنَّ غداً لِنَاظِرِہٖ قریبٌ"

(ہے نظر سے منظرِ فردا قریب)

یہ دورِ جاہلیت کا ایک بہت ہی پرانا مقولہ ہے۔ اور سب سے اول

ادب کی انگشتری میں حکیمانہ جامعیت کا یہ نگینہ جس نے جڑا وہ قراد بن اجدع تھا جس نے نعمان بن منذر تاجدار حیرہ کا زمانہ پایا ہے۔ کہ بظن غالب ۵۸۵ء سے ۶۰۶ء تک فرمانروا رہا۔ اس مثل کی شان تمثیلی بیان کرنے سے پہلے ہم علامہ ابوالفرج اصفہانی کے حوالہ سے ایک واقعہ بیان کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ جس کا ذہن نشین ہو جانا اس مثل کی تاریخی حیثیت جاننے کے لئے ضروری ہے:۔

نعمان منذر عرب کے بت پرستانہ تمدن میں ایک ناقابل رشک شہرت رکھتا ہے۔ شراب اسکی گھٹی میں پڑی تھی۔ اس کی سیاہ مستانہ بادہ گساریوں کے افسانوں سے کتاب الاغانی کے صفحات بھرے پڑے ہیں ظالمانہ استبداد اس کا شیوۂ خاص تھا۔ ایک ذراسی بات پر بگڑ کر کسی شخص کو قتل کر دینا اس کا معمولی ہتھکنڈا تھا۔ خالد بن مضلل و عمرو بن مسعود اس کے دو مے آشام رفیق تھے جو محفل نائے و نوش میں اس کے برابر کے شریک تھے۔ ایک رات مجلس عیش و طرب حسب معمول برپا تھی۔ اور نعمان ان دونوں محبان بادہ پیما کے ساتھ بیٹھا ہوا جام پر جام خالی کر رہا تھا۔ کہ کسی بات پر دونوں دوستوں کی اس سے تکرار ہو گئی۔ شراب کے نشہ میں ہوش و حواس تو بجا تھے ہی نہیں۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ عالم غضب میں حکم دیا۔ کہ دونوں کو اسی وقت زندہ گاڑ دیا جائے۔ وہاں کیا دیر تھی خدام خاص دونوں یاران سرپل کو گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے زمین میں گاڑ دیئے۔ صبح جب نعمان کی آنکھ کھلی۔ تو اگرچہ خمر دوشیں کا خمار تھوڑا

بہت سر میں تھا۔ لیکن عقل ایک حد تک ٹھکانے آچکی تھی۔ رات کے واقعہ کو البتہ موجِ فراموشی بہالے گئی تھی۔ اہالی و موالی سے پوچھا کہ خالد اور عمرو کہاں ہیں؟ انہوں نے عرض کی۔ کہ حضور وہ تو حسب الحکم رات ہی زمین میں زندہ گاڑ دیئے گئے تھے نعمان نے یہ سنتے ہی سر پیٹ لیا۔ متاعِ ہوش و حواس پر پشیمانی کی بجلی ہی تو گر پڑی۔ اور جزع فزع کرتا ہوا اپنے دوستوں کی قبر پر پہنچا۔ تلافی مافات کی اور کوئی شکل تو نکلنی محال تھی۔ البتہ دونوں قبروں پر اس نے دو مخروطی مینار بنوا دیئے۔ اور اُس دن سے عہد کر لیا کہ سال میں دو دن دونوں گذرے ہوئے دوستوں کی یادگار کے لئے وقف کر دیگا۔ دونوں دن وہ ہر ایک قبر پر جا کر ماتم کیا کرتا تھا۔ ان ایام دوگانہ میں سے ایک کا نام یوم البؤس تھا اور ایک کا یوم النعیم۔ یوم النعیم کو جو شخص اوّل اوّل اس کو ملتا تھا۔ اُسے دو سو کالے اونٹ بخش دیتا تھا اور یوم البؤس کو جس شخص سے اوّل اوّل اُس کی مڈبھیڑ ہوتی۔ اُسے ایک ظربیان یعنی کالی جنگلی بلی دے کر اُس کی گردن مروا دیتا۔ اور اُس کے خون سے دونوں مناروں کو لپواتا۔ اسی مناسبت سے یہ دونوں مینار "غریین" یعنی آغشتہ بخون کے نام سے موسوم ہو گئے تھے۔ جن بدنصیبوں کے خون سے یہ مینار مدتوں ارغوانی ہوتے رہے۔ ان میں عہدِ جاہلیت کے مشہور شاعر عبید بن الابرص کا بھی شمار ہے۔

اب ہم مثل زیر تنقید کی تاریخ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں:۔
نعمان بن منذر ایک دن اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر شکار کے قصد

سے باہر نکلا۔ لاؤ لشکر ہمراہ تھا جنگل میں پہنچ کر ایک گورخر پر نظر پڑی جس نے شکاریوں کا ہجوم دیکھتے ہی فراٹے بھرنے شروع کئے۔ نعمان نے گھوڑا پیچھے ڈالا۔ کہ وہ بھی ہوا سے باتیں کرتا جاتا تھا۔ جو سوار ہمرکاب تھے۔ اُنہوں نے بہت تگ و دو کی۔ لیکن اس کی گرد کو نہ پا سکے۔ شکار تو خدا جانے کہاں کا کہاں نکل گیا۔ لیکن نعمان جنگل میں اکیلا رہ گیا۔ اَور راستہ بھی بھول گیا۔ دن بھر ادھر اُدھر ٹاپتا پھرا۔ مگر جنگل کی بھول بھلیاں سے نکلنے کی کوئی صورت نکال نہ سکا آفتاب بھی ڈھل چلا تھا۔ اَور بھائیں بھائیں کرتا ہُوا ویرانہ شام کی بڑھتی ہوئی تاریکی میں چھپ جانے کے قریب آ گیا۔ اتنے میں دُور سے نعمان کو ایک خیمہ نظر آیا۔ تھکے ہوئے گھوڑے کو ایڑ بتا کر وہ اُس خیمہ کے قریب پہنچا! ور صاحب خیمہ کو آواز دی۔ خیمہ میں بنو طے کا ایک شخص حنظلہ نامی اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ حنظلہ نے جب ایک اجنبی کی آواز سُنی۔ تو باہر نکل آیا۔ اور مسافر کو دیکھ کر پُوچھا۔ کہ کیا چاہتے ہو۔ نعمان نے کہا۔ کہ جنگل میں راستہ بھول گیا ہُوں۔ اور رات گذارنا چاہتا ہوں۔ اعراب بادیہ اپنی مہمان نوازی کے لئے شہرۂ آفاق ہیں۔ اَور طے کا قبیلہ تو اس وصف میں امتیاز خاص رکھتا ہے مہمان کا نام پُوچھے بغیر حنظلہ نے اہلاً و سہلاً کہا۔ اور گھوڑے کے دانہ چارہ کا انتظام کرکے مہمان کو خیمہ کے اندر لے گیا۔ حنظلہ کے پاس اس وقت بجز ایک بکری کے جس کا دُودھ اُس کے خوان کی بہترین نعمت تھی۔ اتفاق سے اور کچھ موجود نہ تھا۔ بیوی کو الگ لیجا کر کہنے لگا۔ کہ آج رات ہمارے ہاں یہ مہمان شب باش ہوتا ہے۔ اور وضع قطع سے معزز معلوم ہوتا ہے۔ اسکی خاطر مدارات

اس کی حیثیت ہی کے لحاظ سے ہونی چاہیئے۔ لیکن تم نے ابھی ابھی مجھ سے کہا تھا۔ کہ گھر میں بھونی بھانگ تک موجود نہیں۔ اب بتاؤ کیا کیا جائے گھر والی نے بھی بڑا دل پایا تھا۔ کہنے لگی۔ کہ بکری تو ہے ہی۔ اسے ذبح کر ڈالو۔ کباب اس کے گوشت کے لگا لیئے جائیں گے۔ کچھ گیہوں بھی ایسے ہی موقع کے لیئے رکھ چھوڑے تھے۔ آٹا پیس کر کچھ روٹیاں پکاؤں گی۔ غرض نان کباب سے نعمان کی تواضع کیگئی۔ اور وہ پیٹ بھر کر آرام سے سو رہا۔

صبح اٹھ کر نعمان نے اپنے عالی حوصلہ میزبانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اور چلتے وقت کہنے لگا۔ کہ برادر طائی میں بادشاہ نعمان ہوں۔ تمہاری مہمان نوازی کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں جو کچھ مانگنا ہو۔ مانگ لو۔ حنظلہ نے کہا۔ کہ خدا آپ کو خوش رکھے۔ وہ وقت بھی کبھی آئے گا۔ اگر کچھ مانگنا ہوگا۔ تو انشاء اللہ اسی وقت مانگ لونگا۔

حنظلہ سے راستہ پوچھ کر نعمان تو اپنے دارالحکومت حیرہ کو چلا گیا۔ اور حنظلہ کے لیئے کچھ دنوں کے بعد یہ واقعہ خواب و خیال ہوگیا۔ اس پر ایک زمانہ گذر گیا۔ اور گردش لیل و نہار اپنا رنگ لائی۔ دولت ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے آج کسی کی ہے۔ تو کل کسی کی۔ بے چارہ حنظلہ جو پہلے صاحب جاہ و حشمت تھا۔ اب مفلوک الحال ہوگیا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی۔ کہ میاں بیوی کو کئی کئی دن فاقے سے گذر جاتے تھے۔ اسی عالم عسرت میں ایک دن بیوی نے میاں سے کہا۔ کہ بادشاہ حیرہ نے تم سے حسن سلوک کا وعدہ کیا تھا۔ کیوں نہیں دربار میں جا کر بادشاہ کو وہ وعدہ یاد دلاتے کہ ہماری یہ

پہنچنا دُور ہو۔ یہ بات حنظلہ کی بھی سمجھ میں آگئی۔ اور گھر سے نکل کر سیدھے حیرہ کی راہ لی۔

قضا کار یہ دن نعمان کا یوم بؤس تھا۔ حنظلہ پہلا وہ شخص تھا جس پر آج نعمان کی نظر پڑی۔ نعمان نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا اور کہا کہ تم وہی طائی تو نہیں۔ جس کے گھر میں ایک رات مَیں شب باش ہؤا تھا حنظلہ نے کہا کہ ہاں مَیں وہی طائی ہُوں۔ اور حضوُر میرے ہی یہاں فروکش ہوئے تھے نعمان نے بہ لہجۂ تاسف جواب دیا۔ کہ تم اس دِن کے علاوہ کسی اور دن مجھ سے آکر کیوں نہیں ملے۔ اس بیچارے کو اس واقعہ کا کیا عِلم تھا۔ کہنے لگا کہ مجھے اس کی مطلق خبر نہ تھی۔ نعمان نے جواب دیا۔ کہ آج کا ڈراؤنا دن وہ دن ہے کہ اگر اوّل اوّل مَیں اپنے بیٹے کو بھی دیکھ پاؤں۔ تو اس کے قتل سے بھی مجھے کوئی طاقت نہ روک سکے۔ بہر حال جو تمہیں سوال کرنا ہے کرو۔ اور منہ مانگی مُراد پالو۔ لیکن اپنے آپ کو مقتول سمجھو حنظلہ کہنے لگا کہ زخارف دنیوی کو لے کر مَیں کیا چاٹوں گا جبکہ میری جان ہی کی امان نہیں۔ نعمان نے کہا۔ اس کا میرے پاس کوئی علاج نہیں۔ تمہارا قتل ہو جانا اٹل ہے۔ حنظلہ نے جواب دیا۔ کہ اگر میری قسمت میں یہی لکھا ہے۔ تو مَیں اس پر شاکر ہُوں لیکن آپ سے اتنی مہلت چاہتا ہُوں۔ کہ مجھے ایک دفعہ گھر ہو آنے دیجئے۔ تاکہ میں اپنے اہل و عیال سے مِل لُوں۔ اور جو کچھ وصیت کرنی ہے کر آؤں۔ ان کی طرف سے مطمئن ہو کر مَیں پھر آپ کے پاس واپس آجاؤں گا۔ نعمان نے کہا۔ کہ مجھے تمہاری خواہش منظور ہے۔ بشرطیکہ کسی کو اپنا ضامن چھوڑتے جاؤ۔ اس وقت نعمان کے

درباریوں میں قبیلہ بنی شیبان کا ایک شخص شریک بن عمرو بن قیس موجود تھا۔ کہ اس کی کنیت ابوالحوفزان تھی۔ اور وُہ نعمان کا صاحب الردافہ (چادر بردار) تھا۔ حنظلہ اس کی طرف متوجہ ہوُا۔ اور نظم میں اس سے یوُں خطاب کیا:۔

یا شریکاً یا ابن عمروٍ   ھل من الموت محالہ

اے شریک اے عمرو کے بیٹے   کیا موت سے رستگاری بھی ممکن ہے۔

یا اخا کل مضافٍ   یا اخا من لا اخالہ

اے وہ کہ تو ہر اس شخص کا بھائی ہے۔ جو تجھ سے تعلق پیدا کرے اور جس کے کوئی عزیز واقارب نہ ہو۔ تو اس کا عزیز وقریب ہے۔

یا اخا النعمان فک الیوم   ضیفاً قد اتیٰ لہ

اے نعمان کے بھائی۔ آج تو ایسے شخص کو نجات دلا۔ جو نعمان کا مہمان ہو کر آیا تھا۔

طالما عالج کرب الموت   لا یُنعِمُ بالہٗ

وہ کب سے موت کی سختیاں برداشت کر رہا ہے۔ حتیٰ کہ اس کے دل کو قرار نہیں۔

پتھر کا دل بھی ہوتا تو اس دردناک التجا کو سُن کر متأثر ہو جاتا لیکن نعمان کا صاحب الردافہ کسی اور ہی مٹی کا بنا ہوُا تھا۔ صاف انکار کر دیا۔ کہ میں تمہارا کفیل نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہر شخص ابوالحوفزان ہی نہ تھا۔ پاس ہی ایک خدا کا بندہ قراد بن اجدع بھی کھڑا تھا۔ جسے قبیلۂ بنی کلب سے نسبت تھی آگے بڑھ کر نعمان سے کہنے لگا۔ کہ مَیں حنظلہ کی ضمانت دیتا ہوُں۔ اگر وقت مقررہ

پر یہ نہ لوٹے۔ تو میری گردن اس کی جگہ حاضر ہے۔ نعمان نے ایسے بڑے بڑے غسّال کے موجود ہوتے ہوئے مزید حجت نہ کی۔ اور حنظلہ کو پانچ سو اونٹ دے کر ایک سال کی مہلت پر گھر جانے کی اجازت دی۔ اور اس کے ضامن کو صاف جتا دیا۔ کہ اگر یہ سال بھر کے بعد اسی دن حاضر نہ ہوا۔ تو تمہاری خیر نہیں۔

اس واقعہ کو ایک سال گزر گیا۔ اور نعمان کے یوم البؤس کو صرف ایک ہی دن رہ گیا۔ نعمان اس شبہ میں زمانہ کی روش اور فطرت انسانی کی کمزوریوں کو دیکھتے ہوئے حق بجانب تھا کہ حنظلہ کبھی اپنا وعدہ وفا نہ کریگا۔ چنانچہ اس دن کی شام کو جس کی اگلی صبح یوم البؤس کی خوں چکاں ہیبتیں اپنے ساتھ لانے والی تھی۔ نعمان نے قراد سے کہا ما اراک الا ھالکا غدًا یعنی تو مجھے اس طرح نظر آرہا ہے۔ کہ کل ہلاک ہو جائیگا۔ قراد نے چھوٹتے ہی جواب دیا۔

فان یاک صدر ھذا الیوم ولّی فان غدًا لناظرہ قریب

بام سے گر ڈھلک دے امروز طشت ہے نظر سے منظر فردا قریب

اس شعر کا یہی دوسرا مصرعہ ہے۔ جو آج تک ضرب المثل چلا آتا ہے۔

مثل کی تاریخ تو پوری ہوگئی۔ لیکن ناظرین جاننا چاہتے ہوں گے کہ قراد بن اجدع کے ایثار و فدویت اور حنظلہ کے وعدے کی شان ایفا کا خاتمہ کس طریق پر ہوا۔ اس لئے اس حکایت لذیذ کو ہم دراز تر کرتے ہیں۔

دوسرے دن صبح سویرے ہی نعمان بن منذر گھوڑے پر سوار ہو کر

اپنے خیل وحشم کے ساتھ حسب معمول "غریین" کی طرف روانہ ہوا۔ اور دونوں مناروں کے درمیان پہنچ کر ٹھہر گیا۔ بے چارے قراد کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ نعمان نے حکم دیا۔ کہ اسے قتل کیا جائے۔ لیکن وزراء نے عرض کی کہ اس کے قتل میں جلدی نہ کیجئے۔ ابھی تو دن چڑھا ہی ہے۔ کیا عجب ہے کہ حنظلہ ایفائے عہد کرے۔ اور شام ہونے سے پہلے آپہنچے۔ نعمان اگرچہ ظالم تھا۔ لیکن میزبان نوازی کی وہ خواہش۔ جو ایک احسان مند عرب کا سب سے بڑا وصف ہے۔ اس رات کی یاد میں جو اس نے طائی خیمہ کے اندر جنگل میں گزاری تھی۔ رہ رہ کے اس کے دل میں چٹکیاں لیتی تھی۔ وہ نہ چاہتا تھا۔ کہ حنظلہ قتل ہو۔ اسی لئے یوم البؤس کی بھینٹ وہ قراد ہی کے سر کو بنانا چاہتا تھا۔ اور اس کے قتل میں جلدی کرتا تھا۔ لیکن وزراء کا اصرار بھی البیانہ تھا کہ ٹل سکے۔ بادل ناخواستہ اُس نے قراد کے قتل کو شام تک ملتوی کر دیا۔

آفتاب کائنات کی مسافت کو طے کرتا ہؤا آخر افق کی مغربی منزل میں پہنچا۔ لیکن ابھی تک حنظلہ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ نطع یعنی وہ مدوّر چرمین بساط جس پر خونیوں کی گردن ماری جاتی ہے۔ بچھی ہوئی تھی۔ قراد صرف ایک تہمد باندھے قتل ہونے کے لئے طیار اُس پر کھڑا تھا۔ جلاّد کے تیغہ کی تیزش رگ گلو سے ہم زبان ہونے کے لئے منتظر تھی۔ مجرم کے خویش واقارب غم کی تصویر بنے کھڑے تھے۔ اور اس کی بیوی دردناک لے میں یہ بین کر رہی تھی۔

ایا عین بکی لی قراد بن اجدعا	رھینا لقتل لا رھینا مودعا
اجدع کے غم میں اے مری آنکھ اشکبار ہو	یہ یرغمال قتل ہے کب واگزار ہو

اتته المنایا بغتة دون قومه　　فامسی اسیرا حاضر البیت اضرعا

آئی اسی کو مرگ مفاجات قوم میں　　بے چارگی کی موت سے کس کو فرار ہو

اس عالم کرب و بلا میں ایک شخص دُور سے آتا ہوُا دکھائی دیا۔ قریب تھا کہ جلاّد کا تیغہ قراد کی گردن پر گرے۔ حاضرین یک زبان ہو کر بولے کہ جب تک یہ نہ معلوم ہو جائے کہ جو شخص آ رہا ہے کون ہے۔ جلاّد کو چاہیئے کہ اپنا ہاتھ روکے رکھے۔ نعمان نے اشارہ کیا۔ اور جلاّد ٹھہر گیا اتنے میں وہ شخص قریب آ گیا۔ دیکھا تو وُہ طائی تھا۔ نعمان نے جب اُسے دیکھا تو اُس کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ اور کہا کہ کیا چیز تھی۔ جو تجھے واپس لائی۔ حنظلہ نے جو جواب دیا۔ وہ اس زمانہ کی عربیت کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔ کہنے لگا۔ کہ مجھے پاسِ عہد کشاں کشاں موت کی طرف لے آیا۔ نعمان نے حیران ہو کر پُوچھا کہ وُہ قوت کیا تھی جس نے تجھے پاس عہد پر برانگیختہ کیا۔ حنظلہ نے کہا۔ کہ وہ قوت میرا دین ہے۔

حنظلہ کی اس بات کا نعمان کے دِل پر ایسا اثر ہوُا کہ اس نے اسی وقت قراد اور حنظلہ کا خوُن تو معاف کر دیا۔ اور یوم بؤس و یوم نعیم کی یادگار منانی بھی چھوڑ دی۔ ساتھ ہی اُس نے حکم دیا۔ کہ "غریین" کو پیوند زمین کر دیا جائے اب اُس دِن سے اُس کی زندگی ہی بدل گئی۔ وہ بے اختیار پکار اُٹھا۔

واللہ ما ادری ایھما ادفی و اکرم؟ اھذا الذی نجا من القتل فعاد ام الذی ضمنہ؟ واللہ لا اکون الأم الثلاثۃ

خدا کی قسم مَیں نہیں جانتا کہ ان دونوں میں زیادہ باوفا اور بڑا شریف کون ہے وہ جو قتل سے

بچ گیا تھا مگر پھر قتل ہونے کے لئے واپس آیا۔ یا وہ جس نے اپنی جان کی ضمانت دی تھی۔ خدا کی قسم میں ان دونوں شریفوں میں تیسرا لئیم و رذیل بننا نہیں چاہتا ؎

روما و کارتھج اور عرب کا موازنہ

جس عربی مثل کی تاریخ ہم نے بیان کی ہے اس سے جو سبق حاصل ہوتا ہے۔ وہ ناتمام رہ جائیگا۔ اگر ہم رومتہ الکبریٰ کے شاندار ترین عہد کا ایک واقعہ بر سبیل تقابل پیش کر کے یہ نہ بتائیں۔ کہ بت پرست اور غیر مہذب عرب اپنی فطرت کے اندر حق پسندی کا ایک چمکتا ہوا جوہر شروع ہی سے ایسا رکھتا تھا۔ جس پر روما اور یونان اور کارتھج کے تمدنی خزانے نثار کئے جا سکتے ہیں۔ یہ واقعہ نعمان بن منذر کے عہد سے ۸۰۰ سال پہلے کا ہے جبکہ روما اور کارتھج ایک جان ستاں آویزش میں مصروف تھے۔ اور روما نے اپنے جی میں ٹھان لی تھی۔ کہ کارتھج کا نام و نشان صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے۔ رومائی جرنیل رگیولس مارکس اٹیلیس تین سو تیس جہازوں کا بیڑا لیکر ۲۵۶ قبل مسیح میں افریقیہ پر حملہ آور ہوا۔ اور کارتھج والوں کے ایک جرار بیڑے کو جو امیر البحر ہلکار کے زیر حکم تھا شکست دے کر افریقیہ میں فوجیں اتار دیں۔ رگیولس کا شریک کار ایک اور مشہور رومانی جرنیل "مین لی ایس ولسو لانگس" تھا جس نے اس مہم میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ افریقیہ میں فوجیں اتارنے کے بعد دونوں جرنیلوں نے پہلے شہر "کلاپیا" کو سر کیا۔ اور اسے اپنا صدر مقام قرار دے کر

دولت کارتھیج کا تمام علاقہ حوالۂ تیغ د آتش کرنا شروع کیا۔

موسم زمستان کے قریب آنے پر حکومت رُوما نے غیر مآل اندیشی کی راہ سے آدھی افریقی فوج واپس بُلالی۔ اور بقیہ نصف کو رگیولس کے زیر کمان ساری مہم سر کرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ کارتھیج نے بسر کردگی "ہملکار" و "بوستار" ایک زبردست فوج حملہ آوروں کے مقابلہ کے لئے تیار کی تھی۔ اور فیلانِ کوہ پیکر کی کئی مہیب قطاروں کے علاوہ ہزارہا سواروں کے متعدد جرار دستے مرتب کئے تھے۔ دونوں فوجیں جب آمنے سامنے ہوئیں۔ تو دونوں کی رقابت نے ایک ہی فیصلہ کن تصادم میں اپنے ارمان نکال لئے۔ گھمسان کا رن پڑا کشتوں کے پُشتے لگ گئے۔ اور آخر رومائی شجاعت جس کی سپہ گری اور شان کو نظم و ترتیب نے استوار کر رکھا تھا غالب آئی۔ پندرہ ہزار کارتھیج والے کھیت رہے۔ اور پانسو قیدی۔ اٹھارہ زنجیر فیل کے ساتھ رگیولس کے ہاتھ آئے۔

اس شاندار فتح نے رگیولس کے حوصلے بہت کچھ بڑھا دیئے۔ اور وہ یلغار کرتا ہُوا پایہ تخت کارتھیج سے بیس میل کے فاصلہ پر پہنچ گیا۔ دولت کارتھیج کو اگر روما ہی سے نبٹ لینا ہوتا۔ تو وُہ کبھی جی چھوڑ نہ بیٹھتی۔ لیکن شومئی قسمت سے اس کے ایک صوبہ "نیومیدیا" میں آتش بغاوت مشتعل تھی اور اسے یہ آگ بھی ساتھ ہی ساتھ فرو کرنی تھی۔ اس لئے اس نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ رُوما سے صُلح کر لے۔

رگیولس ایک جری سپاہ سالار تو تھا۔ لیکن ایک نکتہ رس مدبر نہ تھا دولت کارتھیج کی طرف سے جب نامہ و پیام کی سلسلہ جنبانی ہُوئی۔ تو مدبرانہ

کسرو انکسار سے کام لینے کی بجائے رگیولس نے فاتحانہ غرور اور وُہ بھی رومائی غرور کو اپنا شعار بنایا۔ اور صلح کے وفد سے بہ کمال رعونت کہا۔ کہ تم لوگوں کی امان کی صرف یہ شکل ہے۔ کہ ہتھیار ڈال دو۔ اور بلا شرط اطاعت قبول کرو۔

کارتھج اگرچہ دب گیا تھا۔ مگر ابھی تک پرانی آن بان قائم تھی۔ اور اب بھی اس راکھ میں تھوڑے سے شرر دبے ہوئے تھے۔ کارتھج کی سطوت کی بجلی جو ہزیمت کے ابر میں تھوڑی دیر کے لئے غائب ہوگئی تھی نائرۂ غضب بنکر کوندی اور بساط جنگ پھر سے نئے خونریزانہ اشتداد کیساتھ بچھادی گئی۔ تقدیر کچھ یُونانی سرفروشوں کو جن کی شجاعت ان دنوں سونے چاندی کے عوض خریدی جاسکتی تھی۔ کارتھج لے آئی تھی۔ اور ان کا سرگروہ "زن تھابس" جو ایک مقدونی سپاہی تھا۔ فنون سپہ گری میں سرآمد روزگار تھا۔ کارتھج کی فوج اُس کے حوالہ کیگئی۔ اور اس نے جنگ کا نقشہ ہی بدل دیا۔ کارتھج کی دیواروں کے نیچے حریفوں کا مقابلہ ہوا۔ اور رگیولس کی فتح شکست سے مبدل ہوگئی بتیس ہزار رومائی اس خوفناک لڑائی میں کام آئے۔ اور رگیولس گرفتار کر لیا گیا۔ رومن فوج میں سے صرف دو ہزار سپاہی بچے۔ جو بحال تباہ سر پر پاؤں رکھ کر کلا ملیا پہنچے۔ یہ واقعہ عظمی ۲۵۵ء قبل مسیح کا ہے۔

رگیولس پانچ سال تک کارتھج میں قید رہا۔ اس عرصہ میں چرخ نیلوفری کی ایک اور گردش نے فتح و نصرت کا پلہ رومانیوں کی طرف جُھکا دیا۔ اور رومائی جرنیل مٹیلس نے کارتھج کی فوج کو ایک سخت شکست دے کر دولت کارتھج کو پھر مائل بہ آشتی کر دیا تھا۔ جس نے ایک مصالحانہ وفد ہمدکار اور پوستار کی

سرکردگی میں رومتہ الکبریٰ کو روانہ کیا۔ اس وفد کے ہمراہ رگیولس بھی بھیجا گیا۔ تاکہ اپنے اثر سے حکومت رُوما کو صُلح پر مائل کرے۔ اور معاہدہ کی شرائط جہانتک حالات اجازت دیں۔ بحق کارتھج طے کرادے۔

روانگی سے پہلے رگیولس سے عہد لیا گیا تھا کہ اگر صلح نہ ہو تو واپس کارتھج آجائے۔ اور اُس نے با حلف وعدہ کیا تھا۔ کہ اپنے عہد کا پابند رہیگا۔

روما پہنچ کر جب ارکان حکومت کے اجلاس میں ہملکار و بوستار کی جانب سے شرائطِ صُلح پیش ہوئیں۔ تو بجائے اس کے کہ رگیولس اُن کی ہاں میں ہاں ملاتا۔ اُس کی حب وطنی اور غیرت ملی ذاتی اغراض پر غالب آگئی اور اس نے حکومت کو بہ تاکید تمام جنگ جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔ اور یہ مشورہ بہ طیب خاطر قبول کر لیا گیا۔

اسی فیصلہ کے لحاظ سے ہملکار اور بوستار قید کر کے رُوما میں رکھ لیئے گئے۔ خیال ہو سکتا تھا کہ رگیولس اپنی قسم کو جو دشمن نے بحالت اسیری اُس سے لی تھی۔ توڑ کر پھر زندان میں واپس جانا گوارا نہ کریگا۔ لیکن یہاں ہمیں شرافت انسانی ایک تاریک بُت پرست دُنیا کے اندر اپنی اصلی شکل میں چمکتی ہوئی نظر آتی ہے حکومت روما مُصر ہوئی کہ رگیولس کارتھج کو نہ جائے۔ خود رگیولس کے بیوی بچوں اور خویش واقارب نے رو رو کر منتیں کیں۔ کہ ایک با عزت زندگی کی خوشیاں چھوڑ کر وُہ بے آبرُوئی کی موت کے مُنہ کا نوالہ نہ بنے۔ لیکن رگیولس حقارت کی ہنسی ہنسا اور کہنے لگا۔ کہ کیا اس میں عزت ہے۔ کہ مَیں اپنے قول سے پھر وں۔ اور گو طرح طرح کے عذاب دیکر مار ڈالا جاؤں۔ لیکن دنیا میں

نام چھوڑ جاؤں اور زندۂ جاوید ہو جاؤں۔

اس شریفانہ عزم کے ساتھ اپنے اہل وعیال اور اپنے تمام ہموطنوں کو ماتم کرتا ہوا چھوڑ کر رگیولس نے اطالیہ کے ساحل سے ہمیشہ کے لئے لنگر اٹھایا۔ اور کارتھیج جا پہنچا۔ کارتھج والوں کو جب کل واقعہ کا علم ہوا۔ تو ان کے غیظ وغضب کی آگ بھڑک اُٹھی۔ اور انہوں نے اپنے بیکس مگر شریف النفس قیدی کیساتھ وہی سلوک کیا۔ جس کا اُسے خطرہ تھا۔ یعنی سخت جان گزا عذاب دے دے کر اُسے ہلاک کیا۔ اس وحشیانہ سلوک کی خبر جب رُوما پہنچی۔ تو حکومت رُوما کی آتشِ انتقام بھی برافروختہ ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ ہملکار اور بوستار رگیولس کے خاندان کے حوالہ کئے گئے۔ اور ان دونوں نے بھی وحشیانہ عذاب میں گرفتار ہو کر تڑپ تڑپ کے جان دی۔

اس واقعہ کا نعمان وحنظلہ وقراد کے واقعہ سے مقابلہ کیجئے۔ اور پھر دیکھیئے کہ شرافتِ نفس کا حقیقی آئینہ دار کون ہے۔ روما وکارتھج یا عرب؟

روما کے حیرت انگیز تمدن۔ کارتھج کی شاندار تہذیب کے افسانوں سے تاریخ مغرب کے ورق بھرے پڑے ہیں۔ لیکن ان دولتوں کی متفقہ تہذیب رگیولس کی جان نہ بچاسکی۔ کہ وفائے عہد وپاس پیمان کی خاطر وہ اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر کارتھج آتا ہے۔ مگر کارتھج کی شائستگی اس شرفِ نفس کی یہ قدر کرتی ہے کہ اس کا سر بحوالۂ شمشیر کیا جاتا ہے۔ پھر روما اس کا انتقام لیتا ہے۔ تو ہملکار وبوستار سے لیتا ہے۔ جن کا خود کوئی قصور نہ تھا لیکن اس کے مقابل عرب کی یہ حالت تھی کہ ایک ظالم ترین بادشاہ ایک جفاپیشہ

ستمگار کو بھی پاسِ عہد کی اتنی رعایت منظور ہے۔ اور اس تہذیب کی وہ ایسی قدر کرتا ہے کہ اپنی عادت بدل ڈالتا ہے۔ مگر اپنے مجرموں پر آنچ نہیں آنے دیتا۔

عرب قدیم کی یہی شرافت تھی۔ جس کی جانب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خاص انداز میں ایما فرمایا تھا۔ کہ خیارکم فی الجاھلیۃ خیارکم فی الاسلام :-

تم میں سے جو لوگ عہدِ جاہلیت میں اچھے تھے۔ اسلام نے انہیں اور بھی اچھا بنا دیا۔

امثال

(۶)

اِنَّ اَخَاکَ مَنْ اٰسَاکَ

(حقیقت میں تیرا بھائی وہ ہے۔ جو اپنے اوپر تجھ کو ترجیح دے)

حکیم شیراز گلستاں میں کہتے ہیں :-

دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست — در پریشاں حالی و درماندگی

دوست مشمار آں کہ در نعمت زند — لاف یاری و برادر خواندگی

یہ کس قدر سچی حقیقت ہے۔ اور زندگی کا کیسا صحیح فلسفہ ہے اچھے وقتوں کا سب کوئی ساتھی ہوتا ہے۔ لیکن مصیبت میں کتنے ہیں جو ساتھ دیتے ہیں۔ شاید ایک بھی نہ ہو۔ ورنہ یہ کیوں کہا جاتا۔ کہ

سیہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے — کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انساں سے

سعدی کو اس صداقت کے اظہار کے لئے باوصف اس انتہائی بلاغت کے جس میں انہیں خاص امتیاز حاصل ہے۔ ایک نہ دو اکٹھے چار مصرعے کہنے پڑے۔ لیکن خزیم بن نوفل الہمدانی نے اسی سچائی کو چار لفظوں میں ادا کر دیا۔ ان اخاك من اساك یعنی حقیقت میں تیرا بھائی وہی ہے۔ جو تیری اغراض کو اپنی اغراض پر مقدم رکھے اپنی جان سے تیری جان کو عزیز جانے۔ اور آڑے وقت اس طرح تیرے کام آئے۔ کہ خود اپنے کام بھی اس طرح نہ آتا ہو۔

ضرب المثلیں اس طرح تیار نہیں کی جاتیں۔ کہ ایک حجرہ میں قلم دوات لے کر بیٹھ گئے۔ اور دماغ پر زور ڈال کر ایک دل خوش کن جملہ تصنیف کر دیا۔ بلکہ جس طرح جھکڑ کے چلنے۔ کالی گھٹاؤں کے اٹھنے اور بجلی کے کوندنے کے بعد قطرۂ باراں بہنائے دریا پر گرتا ہے۔ اور تخیل قدیم کے رُو سے شکم صدف میں پرورش پا کر لوئے شاہوار بن جاتا ہے۔ اسی طرح امتحان گاہِ حیات کی کٹھن وادیوں میں مشقتیں اُٹھانے اور کڑیاں جھیلنے کے بعد منہ سے دفعۃً ولغتۃً کوئی ایسا جملہ نکل جاتا ہے جو زندگی کے تجربہ کا نچوڑ ہوتا ہے۔ اور پھر وہی جملہ ادب کے گنج شائگاں میں داخل ہو کر عروس معنے کے بنا گوش کا آویزہ بن جاتا ہے۔

ضرب المثل ذیل تنقید کی ابتدا بھی یوں ہی ہوئی تھی۔ عرب قدیم میں ایک شخص گذرا ہے۔ جس کا نام نعمان بن ثواب العبدی تھا۔ اس کے تین بیٹے تھے۔ سعد۔ سعید۔ ساعدہ۔ نعمان اپنے اقران واماثل میں شرف ومجد اور دانش وفرزانگی کے لحاظ سے سربرآوردہ تھا۔ اور ازبس کہ عمر بہت بڑی پائی تھی۔

اسکی بات سب مانتے تھے۔ اور اس کے پند و موعظ کے آگے بڑے بڑے فرزانوں کا سر جھکتا تھا۔ ہر زاغ پر برف کی بارش ہوتے ہوئے جب کئی سال گذر چکے۔ تو باغ پر خزاں آئی۔ بڈھے باپ نے اپنے تینوں جوان بیٹوں کو بستر مرگ پر بلایا۔ اور چلتے چلتے کچھ وصیتیں کیں۔ جن کا ایک ایک حرف آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

تینوں بھائیوں میں سعد اپنی بے مثل شجاعت کے لحاظ سے مشہور تھا عرب کے سورماؤں میں کوئی اس کی ٹکر کا نہ تھا۔ کبھی ایسا اتفاق پیش نہ آیا کہ اُس کے مقابلہ پر کوئی آیا ہو۔ اور اس پر غالب رہا ہو کبھی یہ بات سننے میں نہ آئی کہ اُس نے میدان نبرد میں تلوار نیام سے کھینچی ہو۔ اور اپنے حریف کو پیٹھ دکھائی ہو۔ دُوسرا بھائی سعید عظمت۔ مراتب و جلالت قدر میں اپنے باپ کا مماثل تھا اور نعمان کے تمام اوصاف اس کی ذات حمیدہ میں جمع تھے لیکن سب سے چھوٹے بھائی ساعدہ نے لاابالی مزاج پایا تھا۔ شرابیں پیتا تھا۔ اور رنگین مزاج احباب کی صحبت میں دن رات عیش و عشرت سے بسر کیا کرتا تھا۔

نعمان نے سب سے اوّل سعد کو بلایا۔ اور اس سے کہا۔ کہ بیٹا میں تو اس دُنیا سے رُخصت ہوتا ہُوں۔ چلتے چلتے میری ایک آدھ نصیحت کان میں ڈال لو۔

اچھی طرح سمجھ لو کہ تلوار خواہ اس کی باڑھ کیسی ہی تیز کیوں نہ ہو کند بھی ہو جایا کرتی ہے۔ گھوڑا خواہ وہ کتنا ہی ثابت قدم کیوں نہ ہو کبھی کبھی ناخن بھی لیا کرتا ہے۔ نفش خواہ کس درجہ ہی شوخ کیوں نہ ہو مٹ بھی جایا کرتا ہے۔ اس

لیئے اگر تم زرہ بکتر لگا کر اونچی بنے ہوئے جنگ کے دنگل میں اترو۔ جہاں یہ حالت ہو رہی ہو۔ کہ چاروں طرف سے شعلہ دار و گیر لپک رہا ہو۔ بڑے بڑے سورما لرز رہے ہوں۔ ناتواں غلبہ پا رہے ہوں۔ اور دل کے بودے بھی جرأت کی پھریری لے رہے ہوں۔ تو ایسے وقت میں مصلحت اسی میں ہے کہ دیر و درنگ ذرا بھی نہ کرو۔ اور اپنے حریف کو ہرگز یہ موقع نہ دو۔ کہ وہ تمہیں نیچا دکھا سکے۔ موقع آن پڑے۔ تو پیٹھ دکھانے میں بھی عار نہ سمجھو۔ لیکن شرط یہ ہے۔ کہ ایسی روگردانی عام مصالح پر مبنی ہو۔ انتقام لینا ہو۔ تو کسی حالت میں راہِ فرار اختیار نہ کرو کہ کامیابی اسی کے لئے مقدر ہوتی ہے۔ جو منتقم ہو۔ مدافعت میں نہ پڑو۔ بلکہ ہمیشہ جارحانہ پہلو ملحوظ رکھو۔

سعد کے بعد منجھلے بیٹے سعید کی باری آئی۔ اس کو نعمان نے ان الفاظ میں وصیت کی:-

مردِ سخی کے لئے بخل سزاوار نہیں۔ متاعِ کہنہ و نو جو کچھ بھی ہو۔ اسے صرف کر ڈالو۔ حاجت مند کو لبیت و لعل میں نہ ٹالو۔ تاکہ دنیا میں تمہاری جوانمردی کا شہرہ ہو۔ تم کو ہمیشہ اپنی قوتِ بازو پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ کسی دوسرے پر اعتماد کرنا شیوۂ احتیاط نہیں۔ اس امتحان میں بہت کم لوگ پورے اترتے ہیں تم اپنے بھائیوں کو بھی آزماؤ گے۔ تو دیکھ لو گے۔ کہ قول کے سچے اور بات کے پورے اور دھن کے پکے ان میں گنتی ہی کے ہوں گے۔ بھلائی ہمیشہ کر دینا لیکن ان کے ساتھ جو اس کے اہل ہوں۔

سعید یہ قیمتی نصیحت سن کر چلا گیا۔ اور سب سے آخر میں عمرۃ آیا جو

شراب و کباب و چنگ و رباب کا رسیا تھا۔ باپ نے اُس سے کہا:۔
جانِ پدر! شراب خوری بڑی بُری چیز ہے۔ جو شخص کثرت سے شراب پیتا ہے۔ اور جُم پر جُم لنڈھائے چلا جاتا ہے۔ اس کے قلب میں مادہ فساد پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس کی روزی گھٹ جاتی ہے۔ اپنے یاروں دوستوں کو بھی اچھی طرح پرکھ لیا کرو۔ یہ لوگ شہد کی مکھیاں ہیں۔ جب تک تمہارا دستر خوان وسیع ہے ان کا تمہارے گرد جمع ہوگا۔ لیکن جب تمہارا ہاتھ کشادہ نہ ہوگا۔ تو تمہیں ان کی صورت بھی نظر نہ آئیگی۔ ایک بات اور سُن لو۔ اپنے اہل بیت کی حمایت تم پر فرض ہے اپنے مد مقابل کی اعانت کا خیال رکھو۔ اور سو بات کی ایک بات یہ ہے۔ کہ تمہیں ہر بات میں میانہ روی اختیار کرنی چاہیئے۔ کہ اسی سے تم کامیاب رہ سکتے ہو۔
بیٹوں کو یہ وصیتیں کر کے نعمان نے ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں اور جب اس کی تجہیز و تکفین سے فراغت ہو چکی۔ تو سب سے اوّل منجھلے بیٹے سعید کو یہ خیال پیدا ہوا۔ کہ باپ کی وصیت پر عمل کرے۔ اور اپنے دوستوں اور بھائیوں کو آزمائے۔ یہ بات جی میں ٹھان کر اس نے ایک مینڈھا ذبح کیا۔ اور اسے اُٹھا کر اپنے خیمہ کے ایک گوشہ میں لے گیا۔ جہاں اس نے اسے ایک کپڑے سے ڈھانپ دیا۔ اس حیلہ سے فارغ ہو کر اس نے اپنے بعض معتمد علیہ دوستوں میں سے ایک کو بلایا اور کہا۔ کہ بھائی جان! آج ایک بڑی مصیبت آپڑی ہے آپ پر میرے بڑے بڑے حقوق ہیں۔ یقین ہے کہ اس آڑے وقت میں آپ میرے کام آئیں گے۔ دوست نے کہا۔ کہ آپ سچ فرماتے ہیں۔ میں دل و جان سے خدمت کو حاضر ہوں۔ مگر فرمایئے تو وہ کونسی ایسی افتاد ناگہانی ہے۔ جو آپ پر آپڑی ہے

سعید نے جواب دیا۔ کہ بات اصل میں یوں ہے۔ کہ میں نے ایک شخص کو قتل کر دیا ہے۔ وہ دیکھو خیمہ کے گوشہ میں اس کی لاش کپڑے سے ڈھکی پڑی ہے جب تک میں اس لاش کو ٹھکانے نہ لگا دوں۔ میں خطرہ سے محفوظ نہیں اس میں تمہاری مدد چاہتا ہوں۔ کہ ہم دونوں مل کر لاش کو لے جائیں اور کہیں چھپا دیں۔ دوست نے یہ سنتے ہی ہاتھ کانوں پر دھرے۔ اور کہا کہ حضرت بس مجھے معاف کیجئے۔ بندہ آپ کی گوں کا نہیں۔ یہ کہہ کر دوست صاحب تو چمپت ہو گئے۔ اور سعید نے خیمہ سے نکل کر ایک اور پرانے لنگوٹیے سے اپنی حاجت بیان کی۔ کہ یہ حضرت رفاقت و اخوت کے بڑے لانبے چوڑے دعوے کیا کرتے تھے۔ لیکن جب سعید اپنی کہانی الف ابجد سے لے کر تائے ثمت تک ختم کر چکا۔ تو ان دوسرے بھائی صاحب نے آنکھیں نکال کر اس لہجہ میں کہ گویا آپ ابا عن جد معصوم من الخطا چلے آتے ہیں۔ فرمایا کہ خوب آپ بھائی چارے کا مطلب یہ سمجھتے ہیں۔ کہ میں ایک بیگناہ کے قتل پر پردہ ڈال کر آپ کا ممد و معاون بنوں نا صاحب۔ مجھ سے ایسی ناشدنی حرکت کی توقع ہرگز نہ رکھئے۔ اس دوسرے دوست سے بھی ٹکا سا جواب سن کر سعید نے اسی طرح بہت سے دوستوں سے التجا کی۔ اور سب کی جانب سے ایسے ہی جواب ملتے رہے۔ اور نقش وفا کہیں بھی وجہ تسلی نہ ہوا۔ کہ یہ لفظ شرمندۂ معنی ہونے کے لئے بنایا ہی نہ گیا تھا۔

لیکن جوئیدہ یابندہ۔ دنیا اچھوں سے بالکل ہی خالی نہیں ہو گئی ہے سارے دوست نانی و زبانی ہی نہیں ہوتے۔ کچھ جانی بھی ہوتے ہیں آخر سعید اپنے ایک دوست خزیم بن نوفل سے ملا۔ جو سراپا صدق و صفا تھا۔ سعید نے

جب اس کے سامنے بھی حسب معمول کل ماجرا دہرایا۔ اور تان استمداد پر توڑی تو خزیم نے کہا۔ کہ اپنے اس غلام کے علاوہ جو ہماری باتیں کھڑا سن رہا ہے تم نے اس واقعہ کی اطلاع کسی اور کو تو نہیں دی۔ سعید نے کہا۔ کہ بجز میرے اور تمہارے یا اس میرے غلام کے کسی اور شخص کو میرے راز کی کانوں کان خبر نہیں۔ خزیم نے معنی خیز لہجے میں پھر استفسار کیا۔ کہ اپنے لفظوں کو اچھی طرح جانچ تول لو۔ کہ جو کچھ کہہ رہے ہو۔ اس میں کچھ فرق تو نہیں سعید نے کہا کہ سر مو فرق نہیں۔

یہ سنتے ہی خزیم نے میان سے تلوار کھینچ لی۔ سعید ہکا بکا رہ گیا۔ کہ اس نے شمشیر عریاں کیوں کی۔ لیکن قبل اس کے کہ اس کے منہ سے کوئی بات نکلے۔ یا وہ بیچ بچاؤ کر سکے۔ خزیم نے ایک ہی تلے ہوئے وار میں غلام کے دو ٹکڑے کر دیئے اور کہا کہ لیس عبدنا اخالک یعنی تیرا غلام پاس اخوت و مراعات حق برادری میں تیرا بھائی نہیں ہو سکتا۔ یہ مثل اسی وقت سے زبان زد خلائق ہو گئی۔

سعید کے دل پر اپنے غلام کی تڑپتی ہوئی لاش کو دیکھ دیکھ کر جو گذری سو گذری۔ بے اختیار اس نے خزیم سے کہا۔ کہ تجھ پر خدا کی سنوار۔ یہ نامعقول حرکت تو نے کیا کی۔ اس کے جواب میں خزیم نے اپنے قول اول کا تکملہ اس طرح کیا۔ ان اخاک من اساک۔ کہ یہی وہ مثل مشہور ہے جس کی تاریخ ہم لکھ رہے ہیں۔ اس پر سعید نے اصل حقیقت کہہ سنائی۔ اور مینڈھے کے ذبح کرنے۔ دوستوں اور بھائیوں کو آزمانے اور بجز خزیم کے اور سب کے اس آزمائش میں پورا نہ اترنے کی کیفیت من وعن بیان کی۔ سعید کی داستان اگرچہ ہمہ تن امتنان تھی

لیکن غلام کے قتل کے واقعہ نے انداز بیان میں شکوہ اور ملامت کو بھی ملا دیا تھا اس پر خزیم نے ایک اور بلیغ فقرہ کہا۔ کہ وہ بھی آج کے دن تک ضرب المثل ہے سبق السیف العذل یعنی ملامت پر تلوار سبقت لے گئی۔

یہ مثل اختیار کا ایک دل آویز مرقع پیش کرتی ہے۔ کہ جب اسلام نہ تھا اس وقت بھی عرب کے آداب و اخلاق میں قدیم ترین تمدن عرب کے بعض خصائص فاضلہ کی شعاعیں کیسی جھلک رہی تھیں۔ اسلام نے یہی شعاعیں اور روشن کر دیں جن سے سارا زمانہ جگمگانے لگا۔ اور اس تمدنی کمزوری کی بھی پوری اصلاح کر دی جو سعید کی اعانت میں پسندستی دکھانے کے باعث بے گناہ غلام کے قتل کا باعث ہوئی ہے۔ کہ

مسلمان کے لیے تسرع فی الحکم کسی حالت میں بھی روا نہیں۔ اسلام نے صرف ایک چیز میں تسرع جائز رکھا ہے۔ اور وہ تسرع فی المغفرۃ ہے:

ہم پر خدا کا کتنا بڑا احسان ہے۔ کہ اس نے اسلام کی نعمت ہمیں عطا کی۔

مناظرات

نوشیروان اور نعمان کا مناظرہ

ز شیر شتر خوردن سوسمار عرب را بجائے رسید است کار
کہ گویند نوشیرواں را تفو عجم بر۔ بر ارند روئے خیو

عرب کے عہد جاہلیت نے دنیائے بلاغت کے لیے نثر کی جو میراث چھوڑی تھی

اس کا ایک حصہ تو مثلیں تھیں جن کے نمونے اس سے پہلے دیکھے جا چکے ہیں۔ لیکن ایک دوسرا حصہ مناظرات بھی ہیں۔ جن کا ایک آدھ واقعہ روایات نے اب تک محفوظ رکھا ہے۔ عربوں نے مناظرہ کے لئے جو طریقہ نکالا تھا۔ اُس کا ایک قاعدہ کلیہ یہ تھا کہ مناظرك نظيرك۔ لفظ "مناظرہ" اور لفظ "نظیر" دونوں کا ماخذ ایک ہی ہے۔ لہذا اپنے کسی مناظر کو حضرت جانو اور ناحق کوشش سے اُس پر غالب آنے کی کوشش نہ کرو۔ کیونکہ "مناظر" بھی تمہاری ہی "نظیر" ہے۔

اس ذیل میں ابن القطامی نے ایک عظیم وجلیل مناظرہ کی روایت زیب تاریخ کی ہے۔ جو عربوں کے متعلق ایران میں ہوا تھا۔

عرب کا وہ حصہ جس کا دارالملک "حیرہ" تھا۔ ساسانی سلطنت کی سیاوت اُس پر سایہ فگن تھی۔ کسریٰ نوشیروان اُن دنوں ایران کا شہنشاہ تھا۔ جس کی سطوت سارے ایشیا ہی پر حاوی نہ تھی۔ بلکہ دولتِ رُوما کو بھی اُس کے ساتھ مُدارا و دوستی رکھنے کی ضرورت تھی۔ ایران نے اُس کے متعدد علاقے چھین لئے تھے۔ جن کی واپسی تک اُسے متواضع رہنا ضرور تھا۔

تخت گاہ ایران (مدائن) میں نوشیروانی دربار منعقد ہے۔ عظمائے مملکت و امرائے سلطنت صف بستہ کھڑے ہیں۔ داخلی وفود اور خارجی سفارتیں خاص طور پہ حاضرِ دربار ہیں۔ روما۔ چین۔ ہندوستان اور عرب نے بھی اپنے اپنے قائم مقام بھیجے ہیں۔ جو نوبت بہ نوبت سریرِ نوشیروانی کو بوسہ دیتے ہیں۔ اور مودبانہ انداز میں اپنے اپنے حکمران کی ہوا باندھتے ہیں۔ اپنے

اپنے ملک کی بادخوانی کرتے ہیں۔ عرب کا قائم مقام نعمان بن منذر تاجدار حیرہ تھا۔ جو سب کے آخر میں پیش ہوا۔ مگر سب سے اول "اگر دیر آمدم شیر آمدم شیر" کے فلسفۂ عالیہ سے اُسی نے ارکان دربار کو رُوشناس کرایا۔ تقریر کرتے وقت اُس کا بیان یہ تھا۔ کہ قوم عرب کی حریف دنیا بھر کی قومیں تہذیب و شائستگی میں نہیں ہوسکتیں۔ یہ اتنا بڑا بول تھا۔ جو نوشیروان کی جلالت و جبروت کو خصوصیت سے ناگوار گذرا۔ کہ بدیوں کی تعریف اور اتنی بڑی تعریف کہ ایرانی قوم پر بھی انہیں ترجیح دی جائے۔ یہ منتہائے گستاخی ہے۔ کسریٰ نے اس احساس سے مغلوب ہو کر نعمان کو جن لفظوں میں مخاطب کیا۔ اُن کا ماحصل یہ تھا:۔

نعمان! قوم عرب اور دُوسری قومیں میرے دائرہ اختیار سے باہر نہیں دُنیا بھر سے جو وفد میرے دربار میں آتے ہیں۔ میں نے اُن سب کے حالات دیکھے ہیں۔ اور اُن کے خصائص کو جانچتا رہا ہوں۔ کوئی قوم ایسی نہیں جس کی نسبت میری ایک خاص رائے نہ ہو۔ بصیرت نافذہ نے سریرۃ نیرّہ کی جانب میری راہ نمائی کی ہے۔ اور میں نے رومیوں میں یہ خصوصیت پائی ہے۔ کہ وہ مالوف الاجتماع عظیم التسلط۔ کثیر المدن۔ وثیق البنیان ہیں۔ وہ ایک مذہب بھی رکھتے ہیں۔ جو حلال کو حرام سے ممتاز کرتا ہے۔ نادانوں کی سفاہت کو بڑھنے نہیں دیتا۔ اور جاہلوں کو ایک نظام کے ماتحت رکھتا ہے۔

ہندوستانی قوم بھی ان خصائص میں رُومیوں کی شریک ہے خصوصاً حکمتِ ہند۔ طب ہند۔ وسعت انہار۔ شیرینی اثمار۔ طیب اشجار۔

عجائبِ صنعت۔ دقتِ حساب۔ کثرتِ تعداد کہ ان سب میں ہندوستانی قوم کی قومیت ناقابلِ انکار ہے۔

اہلِ چین بھی اسی منزلت کے شایاں ہیں۔ بالخصوص چینیوں کی بہ کثرت دستکاریاں۔ شہسواریاں اور جوانمردیاں۔ آلاتِ حرب آہن گری میں اُن کی بلند پایگی۔ کہ یہ باتیں اُن کے مخصوصات میں ہیں۔ پھر اُن کا ایک بادشاہ بھی ہے۔ کہ انہیں مجتمع و منظم رکھتا ہے۔

عربوں میں تو کچھ بھی نہیں۔ امورِ دین و دُنیا و شئونِ حزم و قوت کے خصائلِ محمودہ میں کوئی ایسی چیز میں نے اُن میں نہیں دیکھی۔ جو اُن کی فضیلت پر دلیل ہو۔ اُن میں ذلت و خواری ہے۔ صِغرِ نفس ہے۔ وحشی جانوروں اور سرگرداں طائروں کیساتھ اُن کی بُود و باش ہے۔ فقر و فاقہ میں اپنی اولاد تک قتل کر ڈالتے ہیں۔ ایک ایک کو کھا جاتا ہے اور کھائے جاتا ہے۔ دُنیا کے مائدہ فیض پر الوان طعام چنے ہوئے ہیں۔ مگر وہ اس میز سے اُٹھا دیئے گئے ہیں زمانہ کا محل تشریفات اصنافِ لباس سے آراستہ ہے۔ مگر وہاں سے وہ نکال دیئے گئے ہیں۔ شراب خانہ روزگار میں کیسے کیسے شیریں و لطیف مشروبات ہیں مگر نوبت جب اُن کی آتی ہے تو پیالہ سے لب تک منزلوں کی مسافت ہو جاتی ہے۔ تماشا گاہ ایام میں کیسے کیسے ملاہی و ملذات ہیں۔ مگر کوئی ایک بھی اُن کو نصیب نہیں۔ مطعومات و ماکولات میں اُن کی جان اونٹ کے گوشت پہ جاتی ہے۔ اور یہ عجیب شے سب سے لذیذ مانی جاتی ہے۔ یہ وہی گوشت ہے جسے اکثر درندے بھی نہیں کھاتے۔ کیونکہ یہ نہایت ثقیل۔ نہایت دیر ہضم

نہایت مورثِ امراض ہے۔ اور یہ وہی اونٹ ہے جس کی کوئی کل سیدھی نہیں۔ مگر عرب اس پر بھی نازاں ہیں۔

اشتر صراحی گردنا | دانم چہ خواہی کردنا
گردن درازی می کنی | پنبہ نخواہی خوردنا

عربوں کی دنائت اس درجہ بڑھ گئی ہے۔ کہ کوئی مہمان آجائے تو رات کی رات اس کو سونے کے لئے جگہ دینے کو اہم الاعمال سمجھتے ہیں۔ اور معمولی معیار انسانیت کو بطور سندِ شرافت پیش کرتے ہیں۔ مہمان کو اگر ایک دو نوالے کھلا دیئے تو یہ غنیمت بارِ دہ خاندان بھر کو ابدالآباد تک کے لئے شرف بتا دینے کو کافی ہوگی۔ خود عربوں کے اشعار اس دنائت کی دلیل ہیں۔ قصائد اس پر گویا ہیں۔ مرد اس پر فخر کرتے ہیں اور عورتیں اس کا گیت گاتی ہیں۔

البتہ اس قدر کہہ سکتے ہیں۔ کہ دیارِ یمن ادبارِ عرب کا سرمایہ دار نہیں یمن میں بے شک آثار و ماثر ہیں۔ زرہ و خفتان ہیں۔ آبادیاں ہیں۔ قلعے ہیں اور ایسے امور ہیں۔ جو بعض انسانی امور سے کسی قدر ملتے جلتے واقع ہوئے ہیں۔ مگر یہ وہی یمن تو ہے۔ جس کی اجتماع کی تاسیس اور مملکت کی تشئید میر جدِ امجد نے کی تھی۔ اور دشمنوں سے اس کو محفوظ رکھا تھا۔

بایں ہمہ عجیب حالت ہے۔ طرفہ کیفیت ہے کہ اس ذلت و قلت پر اس فقر و فاقہ پر۔ اس خواری و خستگی پر۔ لازم تو یہ تھا کہ عربوں میں سکون ہوتا مسکنت ہوتی۔ مگر بوالعجبی تو یہ ہے۔ کہ وہ اس پر بھی نازاں ہیں۔ اتراتے ہیں انسانیت میں بھی اپنے آپ کو بڑھاتے ہیں۔ اور سب سے اگلی صف میں بٹھاتے ہیں

نوشیروان جب تک یہ تقریر کرتا رہا۔ نعمان بن منذر خاموش تھا۔ روئے زمین کی کسی حکومت کو فر و شکوہ کی نمو داریوں میں ساسانیوں سے دعوئ ہمسری نہ تھا۔ اور نوشیروان تو دولت ساسانیہ کا درۃ التاج تھا۔ اسکی چیرگی کو دیکھتے ہوئے خیرگی ہوتی۔ اگر عرب اس کے منہ آتے نعمان کی شخصیت خود بھی کوئی بہتر نمونہ عربیت نہ تھی۔ عجمیت اس میں بھی سرایت کر گئی تھی۔ اور عجمی طمطراق کا وہ دلدادہ تھا۔ پھر بھی وہ عرب تھا۔ اگرچہ ایک کمزور عرب تھا۔ اور عرب کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو۔ مگر جب قوم کے لئے بات آپڑے گی۔ تو سارے جہان کا زور اس کی زبان میں آجائیگا۔ نعمان کا عربی خاصۂ عزتِ نفس و امتیاز قوم پرستی اس وقت ہر ایک احتیاط و دور اندیشی پر غالب آ گیا۔ کسریٰ کی قہاری اُسے مرعوب نہ کرسکی۔ دماغ مبہوت نہ ہوا۔ قلب میں تذبذب نہ آیا۔ عزم میں تزلزل نہ ہوا۔ اور بھرے دربار میں اُس نے کسریٰ کو جواب دیا۔

نوشیروانی دربار میں سفارتوں کے پیش ہونے پر محل عرض نیاز میں شہریار حیرہ (نعمان بن منذر) نے قوم عرب کے جو مکارم و مناقب گنائے تھے۔ جن فضائل میں اس کو خیر الامم ثابت کیا تھا۔ اور خود ایرانیوں پر بھی عربوں کو ترجیح دی تھی۔ جنکی کہ شہنشاہ کسریٰ نوشیروان کو اس اطراء و اغراق کا جواب تقول و اختلاق سے دینا پڑا تھا۔ بلاغت کلام کو عربوں کی توہین و تنقیص و تہجین میں صرف کرنا پڑا تھا۔ اشاعۂ ماضیہ میں شرح و بسط سے اسکی تعیین ہو چکی ہے۔ لازم تھا کہ اس موقع پر عجم کی مہابت۔ عرب کی صلابت غالب آتی۔ اور طیرۂ سخن کی تاثیر نطق کسریٰ کا جواب سکوت نعمان سے دلاتی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ کہ

ایک صادق الوجدان وثابت العزم عرب اپنی شخصی توہین تو شاید گوارا بھی کر سکتا ہے۔ مگر اپنی قومیت کی توہین وہ ایک لحظہ کے لیئے بھی گوارا نہیں کر سکتا نعمان خاموش تھا۔ مگر اسی وقت تک خاموش تھا کہ کسریٰ کی منطق زور و رو پر تھی۔ اس کا فارغ ہونا تھا کہ بحرِ عرب جوش میں آگیا۔ اور نعمان نے کہا۔ کہ اصلح اللہ الملک۔ جس قوم کو تجھ سا بادشاہ ملے وہ کیوں نہ سامی الفضل۔ عظیم الخطب۔ عزیز المنزلۃ ہو۔ بایں ہمہ بادشاہ نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے بغیر شائبہ ردو تکذیب میرے ذہن میں ہر ایک کا جواب حاضر ہے۔ حضور ناخوش نہ ہوں تو عرض کروں کسریٰ نے اجازت دی تو نعمان نے یُوں تقریر شروع کی۔

ایھا الملک۔ اس مناظرہ میں تیری قوم کی فضیلت و برتری موضوع بحث و محل نظر نہیں۔ کہ عقل و حلم میں بسطت محل و ایوان میں۔ بجبوحہ عز و شان میں اس قوم کا کیا کہنا جس تیرے آبا و اجداد کی سلطنت اور تیری ولایت اور دولت کے باعث خدا کا فضل و کرم نازل ہو لیکن جن دوسری قوموں کا تُو نے تذکرہ کیا ہے۔ اُن میں سے جو قوم بھی عرب کی قرین و مقارن قرار دی جائے تو میزان اعتبار میں عرب ہی کا پلہ بھاری ہو گا۔ اور اہل عرب ہی بڑھ چڑھ کے نظر آئیں گے۔

کسریٰ نے پوچھا۔ آخر کس بات میں عرب بڑھ چڑھ کے نظر آتے ہیں؟

نعمان نے کہا۔ عزت و منعت میں۔ حسن وجہ میں۔ باس و ہیبت میں جود و سخاوت میں۔ حکمتِ لسان میں۔ شدت عقل میں۔ الفت و خودداری میں

پاس وفا ہیں۔

عزت و منعت کا یہ عالم ہے کہ قوم عرب ہمیشہ سے تیرے انہیں آبائے کرام کی ہمسایہ چلی آتی ہے۔ جو کشور گیر و کشور شکن تھے۔ جہاں آراء و جہاں بان تھے۔ لشکر کش و قلعہ کشا تھے۔ بایں ہمہ عرب کی آزادی میں کوئی مزاحم نہ ہو سکا۔ کوئی اُن پر حاکم ہونے کی طمع نہ کر سکا۔ کوئی ان سے مقصد برار نہ ہو سکا۔ پشت اسپ ان کے قلعے ہیں۔ روئے زمین میں اُن کا گھر ہے۔ آسمان اُن کی چھت ہے تلواریں ان کی سپر ہیں۔ ثبات و استقلال اُن کا اثاثہ ہے۔ بجائے کہ دُوسری قوموں کی عزت خاک۔ پتھر اور سمندر کے جزیروں سے وابستہ ہوتی ہے۔

خُوش رُوئی و خُوش رنگی میں ہند و چین و ترک پر عربوں کی ترجیح ظاہر ہی ہے۔ اس حقیقت سے تو کسی کو انکار ہو ہی نہیں ہو سکتا۔

نسب و حسب میں غیر قوموں کا تو یہ حال ہے کہ اپنے اجداد و مورثین اور اکثر اوائل سے ناواقف ہیں۔ تا آنکہ اگر کسی سے اُس کے باپ کے کچھ ہی اُوپر کی پُشتوں کی نسبت سوال کیا جائے۔ تو کوئی صحیح جواب نہ دے سکیگا۔ بخلاف اس کے عربوں میں کون ہے۔ جو اپنے سارے نسب نامہ کو من اولہ الی آخرہ محفوظ نہ رکھتا ہو۔ اس طرح احاطۂ احساب و حفظ انساب میں کوئی اُن کا سہیم و عدیل نہیں افراد نہ اپنے آپ کو غیر قوم کا بتاتے ہیں۔ نہ غیر خاندان سے منسوب کرتے ہیں۔ نہ دُوسرے کو اپنا باپ بتاتے ہیں۔

عربوں کی سخاوت ایسی ہے۔ کہ ایک بہت ہی ادنٰے درجہ کا عرب مثلاً ایک جوان اونٹنی یا ایک بوڑھا اونٹ رکھتا ہے۔ کہ وہی اسکی متاعِ حیات و

مدار کفاف ہے۔ اسباب معیشت میں ماورا اس کے ہر ایک بدونیک وسیلہ سے محروم ہے۔ اور سواری۔ باربرداری۔ کھانے پینے میں سب کچھ اسی پر انحصار ہے۔ کہ ناگاہ شب میں ایک شخص آتا ہے۔ اور خیمہ کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے یہ ایسا مہمان ہوتا ہے۔ کہ ایک پارۂ گوشت اور ایک جرعہ آب اسکی ضیافت کے لیئے کفایت کرتا ہے۔ مگر عرب کی ہمّت دیکھئے۔ کہ وہ اپنا وہی اونٹ ذبح کر ڈالتا ہے۔ اور مہمان کی خاطرداری میں کہ ذکر خیر و یادگار جمیل کا باعث ہے اپنا تمام دنیاوی اثاثہ قربان کر دیتا ہے۔

حکمت لسان میں اللہ تعالےٰ نے انہیں لطفِ سُخن و رونق کلام و حسن بیان و وزن شعر و قوافی و معرفت اشیاء و ضرب المثل و بلاغت و صفت کا ایسا امتیاز عطا فرمایا ہے کہ دوسری جنس کی زبانیں زبانِ عربی کے بالمقابل کچھ بھی نہیں ٭

عربوں کے گھوڑے بہترین گھوڑے ہیں۔ اُن کی عورتیں عصمت و عفت میں دنیا جہان کی عورتوں پر فائق ہیں۔ اُن کی پوشاک سب سے اچھی ہے۔ اُن کی کانیں سونے چاندی کی ہیں۔ اُن کے پہاڑوں کے کنکر پتھر خزف ریزے ہیں۔ اور اُن کے اونٹ تو ایسے ہیں۔ کہ نہ اس قسم کی کسی دوسری سواری پر سفر ہو سکتا ہے۔ اور نہ دشت و بیابان پے سپر ہو سکتا ہے۔

عرب اپنے دین و شریعت کیساتھ اس درجہ قوی تمسک و اعتصام رکھتے ہیں۔ اور زہد و نسک میں اتنا مبالغہ کرتے ہیں۔ کہ اُن کے مہینے تک محترم ہیں۔ شہر تک محترم ہے۔ ایک محترم گھر تک موجود ہے جس کا حج کیا جاتا ہے عبادت کی جاتی ہے۔ قربانیاں ہوتی ہیں۔ اور اس گھر کا اتنا احترام

کرتے ہیں۔ کہ ایک شخص دیکھتا ہے۔ کہ اُس کے باپ۔ بھائی کا قاتل وہاں موجود ہے۔ اور وہ اس سے انتقام بھی لے سکتا ہے۔ اور قتل بھی کر سکتا ہے مگر اس گھر کی حرمت وکرامت اور اُس مذہب کا اعزاز وکرام ایسا کرنے سے اُسے روکتا ہے۔

پاس وفا کی یہ شان ہے۔ کہ ایک شخص نظر بھر کے دیکھ لیتا ہے۔ آنکھ سے اشارہ کر دیتا ہے۔ اور وہی عہد وپیمان ہو جاتا ہے۔ جو اس وقت تک ٹوٹ نہیں سکتا۔ جب تک کہ اُس کی جان نہ جاتی رہے۔ ایک شخص زمین سے ایک لکڑی اُٹھا لیتا ہے۔ اور قرضدار کے پاس اپنے قرضے میں اُسے گرو رکھ دیتا ہے۔ پھر کیا ممکن ہے۔ کہ قرض ادا نہ ہو۔ اور اس عہد میں فرق آئے ایک شخص کو خبر ملتی ہے۔ کہ فلاں اُس کے زیر سایہ آگیا ہے۔ یہ پناہ گیر بعض اوقات بہت ہی دور و دراز مقام کا ہوتا ہے۔ اور پناہ دہندہ سے کوئی رابطہ نہیں رکھتا۔ مگر عرب کے زیر سایہ آجانے کے بعد اگر کسی قبیلہ کی جانب سے اُس پر کوئی حادثہ پیش آیا۔ تو جب تک اُس قبیلہ کو فنا نہ کر ڈالیگا دم نہ لیگا۔ یا پھر اسی جد وجہد میں خود اس کا قبیلہ فنا ہو جائیگا۔ ایک مجرم جس سے کوئی سابقہ معرفت نہیں کوئی رشتہ وقرابت نہیں۔ ارتکاب جرم کے بعد آتا ہے۔ اور ایک عرب کی پناہ میں آجاتا ہے۔ اب اُس عرب اور اُس کے خاندان کی جان ومال اُس پناہ گیر پر فدا ہو جائے گی۔

قتل اولاد کا جو الزام عربوں پر ہے۔ اس کی حقیقت محض اسقدر ہے کہ کچھ ننگ وعار وغیرت ازدواج کے باعث لڑکیاں مار ڈالتے ہیں۔

ایھا الملک۔ تو نے یہ بھی کہا ہے کہ عربوں کی بہترین غذا اُونٹ کا گوشت ہے۔ یہ سچ ہے۔ اس لئے کہ دُوسری غذائیں نہایت حقیر سمجھ کر عربوں نے ترک کر دی ہیں۔ اور ایسی غذا پسند کی ہے۔ جو اجل الماکل و افضل المطاعم ہے۔ انہیں اُونٹوں پر سوار ہوتے ہیں۔ یہی کھانے کے کام میں آتے ہیں۔ کہ بیشتر جانوروں میں یہی کثیر الشحم۔ طیب اللحم۔ رقیق اللبن۔ قلیل القائلہ حلوا المضغ ہیں۔ اونٹ کا گوشت جس طرح کھایا اور پکایا جاتا ہے۔ اس خصوصیت میں کوئی دُوسرا گوشت اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

کیا عرب اس لئے قابل عظمت نہیں کہ اُن میں ایک دُوسرے کو کھائے جاتا ہے۔ اور وہ کسی ایسے شخص کے مطیع نہیں ہوتے۔ جسکی سیاست اُن سب کو مجتمع کر سکے۔

کسی ماہر سیاست کی اطاعت کی ضرورت تو اُس قوم کو لاحق ہوتی ہے جو اپنے آپ کو ضعیف و کمزور دیکھ کر دشمنوں کے حملہ سے ڈرتی ہے کہ اُسے تباہ نہ کر ڈالیں۔ اور اُس کی آزادی سلب نہ کر لیں۔ اس اطاعت کی حاجتمند کوئی بڑی سلطنت ہوتی ہے۔ جس کا کوئی ایک گھرانا کہ سب پر اُس کے فضائل مُرجح ہوں۔ مطاع مانا جاتا ہے۔ لوگ اپنی عنان اختیار اُسی مطاع کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ اور اُسی کے مطیع ہو جاتے ہیں۔ عربوں کو اسکی ضرورت ہی نہیں۔ نہ وُہ ضعیف و کمزور ہیں۔ نہ اُن کی آزادی پر کوئی حملہ کر سکتا ہے ورنہ کوئی فاتح اُن کی شجاعت کا حریف ہوا ہے۔ نہ ہو سکتا ہے۔ وہ سب کے سب پادشاہ بننا چاہتے ہیں۔ مگر کسی کو خراج و محصول نہیں دینا چاہتے۔

بادشاہ نے یمن کی جو حالت بیان کی جاتی ہے۔ اُسکے ساتھ یہ حقیقت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ بادشاہ کے جدِ امجد کو ایسے وقت دیارِ یمن سے تعلق پیدا ہؤا تھا۔ جبکہ اہلِ یمن کا قدیم تمدن پہلے سے موجود تھا۔ ملک منظم۔ امر مجتمع۔ حکومت قائم۔ تہذیب مستقیم۔ بادشاہ کے دادے ایسے وقت یہیں آئے۔ تو کس حال میں آئے۔ اس حال میں آئے کہ مطرود تھے۔ مردود تھے۔ مسلوب النعمت تھے۔ ملک بدر تھے۔ زار نالی کر رہے تھے۔ عرب اگر اعانت نہ کئے ہوتے۔ مدد نہ دیئے ہوتے۔ تو معلوم نہیں۔ دادے جان کی کیا گت بنی ہوتی۔ اور کیا کچھ حادثہ پیش آتا۔

نعمان جب تقریر کرچکا تو کسریٰ نے نہایت مدح و تحسین کی اور شہنشاہی خلعت عطا فرمایا۔ دربار سے رخصت ہوکر جب نعمان ارضِ حیرہ میں واپس آیا۔ تو عربی قومیت کے متعلق ایک مجلسِ شوریٰ مرتب کی۔ جس نے نوشیروانی دربار میں اپنا ایک خاص وفد بھیجا تھا۔

عربی شاعری

عربوں نے غوطۂ دمشق۔ شعب بوان۔ نہر اُبلّہ۔ صغر سمرقند کو عجائب ارض میں شمار کیا تھا۔ آج کل مصر کے اہرام۔ ابوالہول۔ آبشار نیاگرا۔ نہر پناما کو اعجب العجائب کہتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے۔ کہ مادیات کے ذہنی عالم میں عرب جاہلیت کی شاعری اور اُس کی تاریخ سے زیادہ شاید ہی کوئی اور اعجوبہ ہوگا۔ وہ قوم جسے دُنیا بداوت کی وحشیانہ زندگی بسر کرتے دیکھتی تھی جس میں

ساسانیوں کی عظمت وشان نہ تھی۔ رومانیوں کی آن بان تھی۔ جو ناآشنائے فلسفۂ افلاطون تھی۔ ناشناسائے حکمت سولون تھی۔ تہذیب متعارفہ سے جو بیگانہ تھی۔ وحشت و بداوت کی دیوانہ تھی۔ وہی قوم وہی غیر متمدن قوم جب شاعری کی دنیا میں آتی ہے۔ تو اُس کی زبان ابر رحمت بن کر حکمت کے موتی برساتی ہے۔ ربیعتہ بن رباح المزنی جو عرف عام میں زہیر بن ابی سلمی کے نام سے مشہور تھا۔ ایک معمولی بدوی تھا۔ مگر دیکھنا یہی بدوی کیا کیا شائستگی کے حقائق سناتا ہے اور فلسفہ اجتماعیہ کے کیسے کیسے راز بتاتا ہے۔ قبائل عبس و ذبیان میں جنگ تھی۔ حارث بن عوف۔ وہرم بن سنان نے کہ سرداران بنی مرہ تھے کوشش کر کے صلح کرادی۔ زہیر اس واقعہ پر اپنی دلی مسرت کا اظہار ایک پُرزور نظم میں کرتا ہے۔ جو معلقات میں محدود ہے۔ اور جس نے اُس کو احد الثلاثة المتقدمین علی سائر الشعراء کا خطاب بارگاہ علم وادب سے دلایا ہے۔ یعنی تمام شعرائے عرب کے سرگروہ تین ہیں۔ اور ان میں ایک زہیر بن ابی سلمیٰ ہے۔ بقیہ دو امرءالقیس و نابغہ ذبیانی تھے۔

زہیر کو دور جاہلیت کی بزم سخن میں صدر نشینی کا مرتبہ بلا وجہ نہیں ملا۔ معلقات کے دوسرے مصنفین سے جو بات اسے نمایاں طور پر ممتاز کرتی ہے اُس کی شاعری کا نہایت ہی لطیف اخلاقی پہلو ہے۔ اُس کے دوسرے ہم چشم انسانیت کے جذبات بہیمی سے سروکار رکھتے ہیں۔ بزم و رزم کی رنگارنگ کیفیت کو بیان کرتے وقت اُن کا قلم عنان گسستگی میں ابر نوبہار کو بھی پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ اور جس طرح ریگستان عرب کے کسی ناہموار فرزند کے لئے ایک ذرا سی بات

پر اپنے کسی ہم نشین کی جان لے لینا ایک معمولی سی بات ہے۔ اسی طرح ان کے اخلاق کی بے راہ روی ذوق سلیم کا خون روا رکھنے میں بظاہر کوئی مضائقہ نہیں دیکھتی لیکن قصیدہ بانت سعاد کے نامور مصنف کا عالی قدر باپ ان تمام نقائص سے مبرا اور ان تمام لغزشوں سے معرا ہے۔ اور ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ وہ کون سی قوت قدسی تھی جس نے اس نازک خیال سخنور کو اپنے زمانہ کی معتاد حدود سے نکال کر اس زمانہ کی محفل میں لا بٹھایا جب بربریت مٹ چکی تھی۔ توحش کی ظلمت کافور ہو چکی تھی۔ اور روحانیت کی مشعل تمدن کی انجمن میں جگمگانے لگی تھی۔

جب داحس جس نے عرب میں خون کی ندیاں بہا دی تھیں قبیلوں کا صفایا کر دیا۔ انتقام کے دیرینہ بدوی جذبے کی آگ گھر گھر بھڑکا دی تھی معلقات کا خون چکاں موضوع ہے۔ عنترہ نے اس ڈراؤنی جنگ کی تصویر کھینچنے میں جہاں اپنا معجزانہ کمال دکھایا ہے۔ وہاں ان جذبات کے ابھارنے میں بھی اپنے دوسرے معاصرین کی طرح کچھ کم حصہ نہیں لیا۔ جنہوں نے باپ کو بیٹے اور بھائی کو بھائی کے خون کا پیاسا بنا دیا تھا۔ زہیر بھی اس موضوع پر قلم اٹھاتا ہے لیکن اسکی شاعری تلواروں کی جھنکار کی گونج نہیں ہے۔ بلکہ صلح و سلام کا نغمہ ہے۔ اس کا معلقہ اس شاندار فیاضی کے لئے وقف ستائش ہے۔ جو حرب داحس کے خاتمہ اور انعقاد صلح کی محرک ہوئی۔ عبسیوں نے بہت سے آدمی میدان قتال میں کام آئے تھے۔ سلسلہ جنگ کے انقطاع کی صرف یہی ایک صورت تھی۔ کہ خون بہا کی پوری رقم ان کو ادا کر دی جائے۔ ہرم بن سنان اور حارث بن عوف کو مبدء فیاض کی طرف سے یہ توفیق عطا ہوئی اور ذبیانیوں کے ان دو رفیع المنزلت سرداروں نے

نے نہایت ایثار سے کام لے کر کل رقم خود اپنی جیب سے ادا کردی۔ اُن کی اس فراخ حوصلگی کا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ کہ خود اُن کی گردن پر کسی کا خون نہ تھا۔ بلکہ شرافت نفس و حب وطن کے پاک اقتضا نے انہیں اس ایثار پر آمادہ کیا تھا۔ یہ مضمون ایسا نہ تھا۔ جس پر زہیر کہ اُس نے عمر بھر کسی کی ہجا مدح نہیں کی تھی قلم نہ اُٹھاتا۔ وہ لکھتا ہے :-

امن اُمّ اوفیٰ دمنۃ لم تکلم — بحومانۃ الدراج فالمتثلم

(کیا میری محبوبہ ام اوفیٰ جس مکان سے چلی گئی ہے۔ اُس کے کھنڈر ایسے ہو گئے۔ کہ بولتے تک نہیں۔ یہ وہی کھنڈر تو ہیں۔ جو مقامات حومانۃ الدراج و متثلم میں واقع ہیں)

ودار لہا بالرقمتین کانہا — مراجیع وشم فی نواشر معصم

(ام اوفیٰ کا مکان جو مقام رقمتین میں تھا۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہاتھ کے اعصاب پر دوہرے گوندنے گودے ہوئے ہوں۔ مینہ برسنے سے اس مکان کے ٹوٹے پھوٹے نشانات بھی اُسی طرح رہ رہ کے نمایاں ہوتے رہتے ہیں جس طرح ہاتھ کے گوندنے اُبھر اُبھر کے نظر آتے ہوں)

وقفتُ بہا من بعد عشرین حجۃً — فلایاً عرفت الدار بعد توھم

(میں یہاں بیس برس کے بعد آیا۔ اور ان کھنڈروں کے سامنے کھڑا رہا لیکن بڑی مشکل و مشقت سے میں اس مکان کو پہچان سکا۔ کیونکہ ہیئت ہی بدل چکی تھی۔ اور وہم وگمان سے مدد لینے کے بعد کہیں شناخت کی نوبت آئی تھی)

سئمت تکالیف الحیاۃ و من یعش ثمانین حولاً لا اباً لک یسام

(زندگی کی تکلیفوں سے میں تنگ آ گیا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ان تکلیفات میں جس نے اسّی برس کاٹے ہوں۔ وہ تنگ آ ہی جائیگا۔ کہ پیرانہ سالی خود موجب تکلیف ہے)

و اعلم علم الیوم و الامس قبلہٗ و لکننی عن علم ما فی غدٍ اعمی

(میں جانتا ہوں۔ کہ واقعات حاضرہ سے کیا نتیجہ نکلنے والا ہے۔ واقعات سابقہ سے کیا کیا نتائج مترتب ہو چکے ہیں۔ موجودہ و گذشتہ سب کی واقفیت مجھے ہے۔ لیکن یہ امر کہ کل کیا ہوگا۔ اور آئندہ کیسے واقعات پیش آئیں گے۔ اس علم سے میں جاہل ہوں۔ اور اس کو بالکل نہیں جانتا)

و من لم یصانع فی امورٍ کثیرۃٍ یضرّس بانیابٍ و یوطا بمنسم

(زمانہ کا یہ حال ہے۔ کہ جو شخص اکثر معاملات میں زمانہ کا ساتھ نہ دے گا۔ اور لوگوں کے ساتھ رفق و مدارا سے پیش نہ آئیگا۔ اُسے چار و ناچار مقہور و ذلیل ہونا پڑیگا)

و من یجعل المعروف من دون عرضہٖ یفرہٗ و من لا یتق الشتم یشتم

(جو شخص خیرات و حسنات کو اپنی عزت و آبرو کے ردبرو لائیگا۔ یعنی لوگوں کے ساتھ بھلائیاں کر کے اپنے ننگ و ناموس کو بچائیگا۔ اُس کی آبرو بچ جائیگی اور جو شخص موجبات سب و شتم سے نہ بچیگا۔ یعنی ایسے کام نہ کریگا۔ جن کے باعث لوگ اُس کو بُرا نہ کہیں۔ لامحالہ اس کی تذلیل ہو گی۔ اور اس کو گالیاں دی جائیں گی)

و من لا یکرم نفسہ لا یکرم و من یغترب یحسب عدواً صدیقہ

(جو شخص پردیس میں ہو۔ وہ اپنے دشمن کو بھی دوست سمجھنے لگیگا۔ اور جو اپنی آپ عزت نہ کرے گا۔ اور خودداری کو بالکل ہی بالائے طاق رکھ دیگا۔ تو لوگ بھی اُس کی عزت نہ کریں گے۔)

ومهما یکن عند امرئٍ من خلیقةٍ   وان خالها تخفی علی الناس تعلم

(اگر کسی کی سرشت ہی میں کوئی خصلت فطری ہے۔ تو خواہ وہ اسے کتنا ہی کیوں نہ چھپائے۔ اور خیال کرتا ہو۔ کہ لوگوں سے یہ بات پوشیدہ رہے گی۔ مگر وہ پوشیدہ نہ رہیگی۔ اور لوگ اس کو جان جائیں گے)

وکائن تری من صامتٍ لک معجبٍ   زیادته او نقصه فی التکلم

(کتنے لوگ ایسے ہیں۔ کہ خاموش بیٹھے ہیں۔ اور تم اُن کی نسبت نہایت عمدہ رائے رکھتے ہو۔ مگر اُن کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے۔ جب وہ باتیں کریں۔ کہ تکلم ہی سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ دوسروں سے ان کے فضائل زیادہ ہیں یا کم ہیں)

لسان الفتی نصفٌ ونصف فؤادہٗ   فلم یبق الا صورة اللحم والدم

(انسان کے دو ہی حصے ہیں۔ نصف حصہ میں تو زبان ہے۔ اور نصف میں دل۔ یعنی انسان کی آدھی قدر و قیمت تو اُس کی زبان سے وابستہ ہے اور آدھی اُس کے دل سے۔ اب باقی کیا رہ گیا۔ صرف گوشت اور خون کی صورت باقی رہ گئی۔ اور کچھ نہیں۔)

رایتُ سفاةَ الشیخ لا حلم بعدہٗ   وان الفتی بعد السفاھة یحلم

(میں نے دیکھا ہے۔ کہ بوڑھا آدمی اگر کج خلق ہو۔ تو اُس کے اخلاق نہیں بدل

سکتے۔ اور نہ اُس میں خوبیاں آسکتی ہیں۔ مگر جوان کی حالت اس کے خلاف ہے۔ بداخلاقی کے بعد بھی وہ حسنِ اخلاق پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

سالنا فاعطیتم وعدنا فعدتم ومن اکثر التسائل یوماً یحرم

(ہم نے تم سے سوال کیا۔ تم نے عطیات سے اس کا جواب دیا۔ ہم نے پھر سوال کئے۔ تم نے پھر بھی جواب دیئے۔ حالانکہ ہوتا یہ ہے۔ کہ جو بہ کثرت سوال کرتا ہے۔ اُسے ایک نہ ایک دن محروم ہونا پڑتا ہے)۔

یہ اشعار اگر جیز انشاد میں نہ آئے ہوتے۔ تو شاید حرب داحس پھر چھڑ جاتی۔ اور خون کی نئی ندیوں سے ریگزارِ عرب لالہ زار ہو گیا ہوتا۔ اسلئے کہ حصین بن ضمضم نامی ایک عرب کی بے عنوانیوں سے فریقین کی آتشِ غیظ و غضب پھر بھڑک اُٹھی تھی۔ اور وہ تلواریں جنہیں ہرم و حارث کے فیاضانہ ایثار نے جوہر آزمائی سے روک رکھا تھا۔ پھر بے نیام ہوا چاہتی تھیں۔

یہ تھی عربوں کی شاعری کہ باصد ہزار توحش بھی وہ جو کچھ کہتے ہیں تہذیب آج چودہ سو برس کے بعد بھی اس پہ ایک حرف تک کا اضافہ نہ کر سکی۔ اور یہ تھا عربوں میں شاعری کا اثر کہ ایک جنگِ عظیم چھڑا ہی چاہتی ہے جس کے روکنے میں تمام اصابتیں تمام مآل اندیشیاں بے کار ثابت ہو رہی ہیں مگر ایک شاعر اُٹھتا ہے۔ اور اپنے چند اشعار کے ذریعہ سے قوم پر ایسا اثر ڈالتا ہے کہ جنگ خود بخود رُک جاتی ہے۔ اور جنگ آوروں میں حرب و ضرب کی جگہ صلح و سلام کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں۔ کاش ہمارے شعراء میں بھی یہی روح ہوتی اور اخلاقی دُنیا میں ہماری شاعری بھی اسی طرح اثر انداز ہو سکتی۔

گولڈزیہر کے استشراقی فضائل عالم آشکارا ہیں۔ لغات عرب میں اُس نے ایک حکیمانہ کتاب لکھی ہے۔ جس میں دورِ جاہلیت کے مضمون پر ایک جامع تبصرہ موجود ہے۔ اس معرکہ آراء تصنیف کا حوالہ دے کر پروفیسر نکلسن لکھتے ہیں۔ کہ زہیر بن ابی سلمی کے حالاتِ زندگی جلباب خفا میں مستور ہیں۔ اور تاریخ اس نامور شاعر کی حیات پر بہت کم روشنی ڈالتی ہے۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ بہ گمان غالب اُس کا انتقال اسلام سے پہلے ہوا۔ اگرچہ ساتھ ہی یہ روایت بھی ماثور ہے۔ کہ جب زہیر کی عمر سو سال کی ہوئی۔ تو وہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلّم کے حضور میں حاضر ہوا۔ جو ذوقِ سخن سرائی اسے اپنے چچا بشامہ سے ترکہ میں ملا تھا۔ وہ آگے چل کر اس کے بیٹے کعب کے حصہ میں آیا جو مشہور قصیدہ "بانت سعاد" کا مصنف ہے۔ یہ بیان گولڈزیہر کا ہے لیکن واقعہ صرف اسقدر ہے۔ کہ خود زہیر کو حضور خواجۂ دو جہان علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حضوری کا شرف حاصل نہیں ہوا تھا۔ بلکہ یہ عزت کعب بن زہیر کو حاصل ہوئی تھی۔

زہیر جو کچھ لکھتا تھا۔ نہایت جانچ تول کر لکھتا تھا۔ کہتے ہیں۔ کہ ایک قصیدہ لکھنے میں اُسے چار مہینے صرف کرنے پڑتے تھے۔ پھر چار مہینے میں وہ مسودے کی تصحیح کرتا رہتا تھا۔ اس کے بعد چار مہینے تک ترمیم شدہ مسودے کو اصلاحاً اپنے معاصرین کو دکھاتا رہتا تھا۔ اور ایک سال سے پہلے پہلے اپنا کلام مجامع عام میں پیش نہ کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے قصائد کو "حولیات" کہا گیا ہے (حول بمعنی سال۔)

مروّج الذہّب
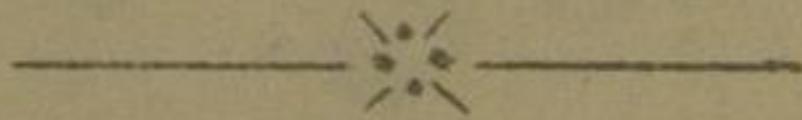
سِلسِلہ تاریخ اِسلام

مروّج الذّہب

سلسلۂ تاریخ اسلام

علّامہ مسعودی } کہتے ہیں کہ ہیرودوٹس تاریخ کا ابوالآبا ہے۔ یونان قدیم کے متعلق جس کے سر پر ظلمت اندوز روایات کا ایک ابر مظلم چھایا ہوا ہے۔ یہ قول صحیح ہوگا۔ اس لئے کہ اُس عہد عتیق میں بت پرستانہ روایات کے دُھندلکے سے نکل کر تفحص اور روایات کی روشنی میں آنا ایک بڑا کام تھا۔ اور یہ کام ہیرودوٹس نے بڑی خوبی کے ساتھ انجام دیا لیکن یونان قدیم اور دسویں صدی عیسوی کی دُنیا میں زمین آسمان کا فرق ہے کہ اس میں اسلام کا خورشید عالمتاب کائنات کے چپے چپے کو عقل و حکمت کی روشنی سے منوّر کر چکا تھا۔ بچہ بچہ حقائق کے دریا بہانے کے قابل ہو گیا تھا اس عہدِ زرّیں میں قریہ قریہ کو ایتھنس ہونے کا دعویٰ تھا۔ ایک ایک چوپال

ارسطو کا دار الحکمت اور افلاطون کی اکاڈمی تھی۔ اس زمانہ کے اگر کسی مورخ کی جلالت قدر کے سامنے آج کل کے یورپ کا سرِ ادب بھی خم ہو۔ اور اُس کی مبصرانہ تحقیق و وسعت نظر کی دھاک ہر مغربی مستشرق پر بیٹھی ہوئی ہو۔ تو اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ کہ اُس کی شان کس قدر رفیع اور اُس کا مرتبہ کتنا بلند ہو گا۔

علامہ ابو الحسن علی بن الحسین بن علی المسعودی جن کی معرکہ آرا کتاب "مروج الذہب و معادن الجواہر" کا اردو ترجمہ ہم اہل نظر کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا برطانیکا کے فاضل مقالہ نگار کی رائے میں ہیرودوتس کا جواب ہیں۔ اور پروفیسر نکلسن بھی اس خیال میں مقالہ نگار موصوف کے ہم صفیر ہیں لیکن حق یہ ہے۔ کہ ہیرودوتس کو مسعودی سے وُہی نسبت ہے۔ جو ذرہ کو آفتاب سے یا نقطہ کو کتاب سے ہم بہ تتبع علامہ ابن خلدون مسعودی کو امام المورخین کہہ کر اُن تمام فضائل کا استقصا کئے دیتے ہیں۔ جو دُنیا کے ایک بڑے سے بڑے مؤرخ کی ذات میں اسلامیوں کے نزدیک جمع ہونے ممکن ہیں۔

علامہ محمد وح نویں صدی مسیحی کے اواخر میں پیدا ہوئے۔ اور آپ کا مولد دار السلام بغداد ہے۔ یہ زمانہ جیسا کہ ہم اشارۃً بتا چکے ہیں۔ دولت عباسیہ کا عہد فضیلت مہد تھا۔ کہ پروفیسر براؤن کا استشراق اسے اسلام کا عہدِ زرین قرار دیتا ہے۔ خداوند قدوس کی مشیت میں جس کیلئے بزرگی مقدر ہوتی ہے۔ اُسے وہ بسا اوقات اپنے خزائن غیبی سے اکتسابی شرافت کیساتھ انتسابی فضیلت بھی مرحمت فرماتا ہے۔ مسعودی ایسے ہی خوش نصیب لوگوں میں سے تھے جیسا کہ اُن کا نام ظاہر کر رہا ہے اُن کا سلسلہ نسب حضرت عبداللہ بن مسعود صحابی

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے جا ملتا ہے۔ اور اس لئے اگر مسعودی جامع کمالات وہبی و کسبی ہیں تو یہ ان کی آبائی میراث ہے۔

آج تو مسلمانوں کی یہ حالت ہے۔ کہ گھر سے نکل کر اگر محلہ کی مسجد میں جا کر دو رکعت نماز قضا کا ارادہ کر لیتے ہیں تو سمجھنے لگتے ہیں۔ کہ بس اب ہم قل سیروا فی الارض کے مفسر ہو گئے۔ لیکن ایک زمانہ وہ بھی تھا جب ایک مسلمان مغرب اقصیٰ کی گھاٹیوں سے نکلتا تھا۔ تو سمندروں کو قطع کرتا ہوا اور کوہ و صحرا کو گرد کی طرح پیچھے چھوڑتا ہوا دیوار چین کے سایہ میں جا دم لیتا تھا اور اپنے ایک بھائی سے اگر دہلی میں ملاقات کرتا تھا۔ تو دوسرے سے بیکن میں علامہ مسعودی نے بھی انہیں جہاں گشتا روایات کی گود میں پرورش پائی تھی تعلیم سے فارغ ہو کر منتہیانہ قابلیت کی سند حاصل کی۔ انہوں نے دُنیا کے سفر کے لئے گھر سے باہر قدم نکالا۔ کہ اپنی آنکھوں سے ہر ملک ہر قوم اور ہر ملت کے حالات کی چھان بین کر کے اندازہ لگائیں کہ اقوام عالم کے عروج و زوال اور صعود و ہبوط کے کیا اسباب ہیں۔ مصدقین کس درجہ پر پہنچے ہیں۔ اور مکذبین کی عاقبت کیا ہوئی ہے۔ اس حقیقت کبریٰ کا اظہار خود علامہ ممدوح کے خامۂ براعت طراز نے اس طرح کیا ہے:۔

"جو شخص اپنے گھر سے کبھی باہر نہ نکلا ہو بلکہ اُسی قدر مبلغ علم پر قانع رہے۔ جو خود اپنے ملک کی تاریخ کے بارہ میں اُسے حاصل ہو سکتا ہو۔ وہ ہرگز اس شخص کی برابری نہیں کر سکتا۔ جس نے اپنی عمر بجائے حضر کے سفر میں بسر کی ہو جس نے اپنے دن بے قرارانہ بادیہ نوردیوں اور کشور گردیوں

ہیں گذارے ہوں۔ اور جس نے ہر طرح کی حیرت انددز اور گراں مایہ اطلاعات
اسی کنز مخفی سے بہم پہنچائی ہوں ؛

علامہ مسعودی کا شمار، اسی دوسرے طبقہ کے نفوس قدسیہ میں تھا کہ ان میں بھی انہیں درجہ صدارت حاصل ہے۔ اس ہمہ گیر سفر میں اس بےمثل کتاب کی حقائق آفرینیوں کا انہوں نے سرمایہ بہم پہنچایا۔

علامہ مسعودی کی سیاحت کی پہلی منزل یہی خاک پاک ہند ہے۔ اور ہندوستان ناز کرسکتا ہے۔ کہ آسمان حقیقت کے ایک ایسے بڑے شمس بازغ کی تجلیوں سے اس کا ذرہ ذرہ غیرت خاوراں ہؤا۔ ۱۹۱۲ئ میں مسعودی پہلے منصورہ آئے۔ پھر ملتان پہنچے۔ اور وہاں سے عازم دکن ہوئے۔ ملتان کو تو کون نہیں جانتا۔ اس کی عظمت کا زمانہ اگر خواب وخیال ہوگیا ہو۔ تو کم از کم یہی پیش افتادہ شعر آج بھی اس کی معرفی کی خدمت انجام دے سکتا ہے کہ:۔

چار چیز است تحفۂ ملتان   گرد، گرما گدا و گورستان

اگرچہ حضرت شیخ بہاؤ الدین زکریا قدس سرہٗ کی یادگار جناب خان بہادر مخدوم حسین بخش سلمہ اس پر جبیں بہ جبیں ہوئے بغیر نہ رہینگے۔ کہ اسی ارض تابناک کے آثار باقیہ میں سے ہم کو اگر کچھ نظر آیا۔ تو چند ٹوٹی پھوٹی قبریں چند خاک کے بگولے۔ چند تمازت ریز امواج سموم۔ چند گدایان مبرم کے کشکول لیکن حقیقت کو کیا کیا جائے۔ کہ اس کو اسی پر اصرار ہے۔ منصورہ البتہ ایسا مقام ہے۔ کہ اس کا ہندوستان کی تاریخ میں نام ہی نام رہ گیا ہے۔ سندھ کے اس مشہور تاریخی مقام کے حیرت انگیز عربی تمدن۔ اس کی عدیم النظیر رونق۔ اس کے بے مثال

علمی کارناموں سے اسلامی تاریخ کے دفتر کے دفتر بھرے پڑے ہیں۔

مسعودی ایران ہوتے ہوئے ہندوستان آئے تھے۔ اور ان دونوں ملکوں کے دلفریب مشاہدات میں اُن کے تین سال بسر ہوئے۔ فارس اور سوسیانہ کے حالات اُنہوں نے بہ تفحص فراہم کئے۔ اور مجمبیوں کے کتب و صحائف کی نسبت دقیق معلومات کا ذخیرہ جمع کر لیا۔ جس کا ثبوت اُن کی تصانیف سے ملتا ہے۔ اس سہ سالہ سیاحت کے بعد انہوں نے بصرہ کو مراجعت کی۔ جہاں اُن کی ملاقات ابوزید سے ہوئی۔ کہ اُن کا شمار اُس عہد کے مشہور جغرافیہ نویسوں میں ہے۔ ابوزید نے ممالک مشرقیہ کی جو تفصیل سپرد قلم کی ہے۔ اُسے مسعودی کی تحریرات کے ساتھ ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

بصرہ سے ۹۱۵ء میں مسعودی پھر عازم مشرق ہوئے۔ اور پہلے کھمبایت آئے۔ پھر سیمور گئے۔ اور ایک زمانہ وہاں بسر کر کے روانہ سیلان (سیلون) ہوئے۔ جس کا دوسرا نام سراندیپ ہے۔ اور جہاں حسب معمول اُن کی کنج کاویاں سرگرم عمل رہیں۔ یہاں سے جہاز پر سوار ہو کر اُنہوں نے چین کا سفر کیا۔ اور چین سے جو مراجعت کی تو موجوں کی سینہ شگافی کرتے ہوئے سیدھے مدغاسکر پہنچے۔ اور وہاں کچھ دن قیام کر کے اپنے وطن کو لوٹے۔

تمام وہ علاقہ جو بحیرہ خزر کے نواح میں واقع ہے۔ تمام ارض شام تمام فلسطین کا مسعودی نے چپہ چپہ چھان مارا۔ اور کوئی واقعہ ایسا نہ تھا۔

جو اُن کے مشاہدے سے گذرا ہو - اور اُن کی یادداشت میں ٹانگ نہ لیا گیا ہو -

۹۲۶ء میں جب وہ فلسطین پہنچے - تو کلیسیائے مسیحی کی زیارت کی اور وہاں سے چل پڑے ۹۴۳ء میں انہوں نے انطاکیہ کے کھنڈروں کی چھان بین کی جس کی پُوری تفصیل اُن کی زبانی ہم تک پہنچی ہے -

مروج الذہب کی تصنیف کا سال بھی ۹۴۳ء ہی ہے -

اپنی شاندار زندگی کے آخری دس سال علامہ مسعودی نے شام و مِصر میں گذارے - اور اُن کی وفات ۹۵۶ء میں ہوئی -

مقالہ نگار انسائیکلو پیڈیا مسعودی کی حیات پر نظر انتقاد ڈالتا ہُوا اس محقق یگانہ کے گوناگوں عقلی و اخلاقی کمالات کا اعتراف ان الفاظ میں کرتا ہے :-

"اس زمانہ میں مُسلمانوں کی تجارتی سرگرمیاں دنیائے معلومہ کے ایک بہت بڑے حصہ پر پھیلی ہُوئی تھیں - اور عراق دنیا کی تجارت کا مرکز سمجھا جاتا تھا مسلمانوں کی فاتحانہ سطوت - اولوالعزمانہ تجارت اور مبلغانہ مساعی - ایشیا اور افریقہ کے بعید ترین گوشوں تک جا پہنچی تھیں مسعودی کی ہمہ گیر سیاحتوں کی تگ و دو بھی انہیں حدُود سے متجاوز تھی لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ مسعودی کے سفر کی غرض و غایت جلب منفعت تھی - اُس کا مقصد یہ تھا - کہ ہر خصوصیت کا بہ نگاہ امعان مطالعہ کرے اور وہاں آثار قدیمہ - حالات تاریخی - اور اخبار و آداب کے بارہ

میں جو کچھ معلومات فراہم ہوسکتی ہوں کرے ۔ وہ تعصب سے بالکل پاک تھا ۔ اور کہیں نہ ہوتا جبکہ اُس کے عقائد معتزلی تھے ۔ اور وُہ مسئلہ اختیار کا قائل تھا ۔ یہ اسی رجحان طبع کا باعث تھا ۔ کہ اُس نے ایرانی مجوسیوں اور مسیحی مستفنوں کی تصانیف سے بھی برضا و رغبت تمام اقتباسات لے لینے مناسب سمجھے ہیں ۔

اس رائے کے بعض حصوں سے ہمیں اختلاف ہے علامہ مسعودی تفضیلی ضرور تھے ۔ مگر فضیلت اہل بیت میں اُن کے تمام تر اعتقادات و خیالات آئمہ محدثین عرب کے اعتقادات کے دوش بدوش تھے ۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اُن کا شمار اکابر معتزلہ میں تھا ۔ انسائیکلو پیڈیا برطانیکا کی ایک انوکھی جدت طرازی ہے ۔

جبر و اختیار کی گتھی کو اسلام نے ایک انداز خاص میں سلجھایا ہے از روئے قرآن مجید انسان نہ مجبور محض ہے نہ مختار مطلق ہے ۔ اس کی حالت اس کے بین بین رکھی گئی ہے ۔ ناسخ لکھنوی نے اسی خیال کو کس خوبصورتی سے ادا کیا ہے :-

چلا عدم سے میں جبراً تو بول اُٹھی تقدیر
بلائیں پڑنے کو کچھ اختیار لیتا جا

یہی اسلامی عقیدہ علامہ مسعودی کا بھی تھا ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ انسائیکلو پیڈیا برطانیکا کے مقالہ نگار نے کس بنا پر یہ لکھ دیا کہ مسعودی جبری و قدری تھے ۔ رہی یہ بات کہ مسعودی کا دامن تعصب سے پاک تھا ۔ تو یہ

کچھ ایسا وصف نہیں ہے جس میں ہمارے سلف صالحین میں کسی بلند پایہ عالم یا محقق کو اپنے ہم چشموں کے مقابلہ میں کوئی خاص امتیاز ہو۔ اس لئے اگر مجوسیوں اور گبروں کی حکمت سے مستفید ہونا اس حد تک کہ خذ ماصفا ودع ماکدر کا حکیمانہ اصول پیش نظر رہے۔ بے تعصبی کی علامت ہو۔ تو یہ تو اسلام کی سب سے پہلی تعلیم ہے کہ الحکمۃ ضالۃ المومن من وجدھا فھو احق بھا۔ حکمت جہاں کہیں بھی ہو جس شکل میں بھی ہو۔ جس شخص کے بھی پاس ہو۔ وہ تو مسلمانوں کی آبائی میراث ہے مسعودی نے اگر ترسائیوں اور کلیسائیوں سے مل کر اُن کے خیالات کا مفید ترکہ ہمارے لئے چھوڑا ہے۔ اور اُن کے واقعات کا دفینہ حوالۂ تاریخ کیا ہے۔ تو یہ اسلام کا ایک معمولی کرشمہ ہے۔

مقدمہ

الحمد للہ اھل الحمد مستوجب الثناء والمجد وصلی اللہ علی سیدنا محمد خاتم النبیین وعلیٰ آلہ الطاہرین وسلم تسلیما الیٰ یوم الدین۔ اما بعد۔

اخبار الزمان } حالات زمانہ میں ہم نے اپنی جو کتاب "اخبار الزمان" تصنیف کی ہے۔ اس میں زمین کی ہیئت، روئے زمین کے شہر۔ معمورات۔ عجائب و غرائب۔ بحر و بر۔ کوہ و نہر بدائع معادن اصناف۔ مناہل۔ ٹاپو۔ سمندر کے جزیرے۔ چھوٹے چھوٹے

بحیرے۔ قابلِ تعظیم عمارات۔ شایانِ شرف مساکن۔ شان مبدء۔ اصل نسل اختلافات وطن۔ وہ جو پہلے نہر تھی۔ پھر دریا ہو گئی۔ وہ جو پہلے دریا تھا، پھر خشک زمین بن گیا۔ وہ جو خشک زمین تھی۔ پھر دریا ہو گئی۔ انقلاب ایام و مرورِ دہور سے ایسا کیوں ہؤا۔ اس کی علت کیا ہے۔ اس کے فلکی و طبیعی اسباب کیا ہیں۔ کون کون سی اقلیم کس کس سیارہ کے خواص سے مربوط ہے کن کن ثوابت کے افعال سے متعلق ہے۔ نواحی و آفاق کی مقدار۔ تاریخ قدیم میں لوگوں کا تباین و تخالف۔ اسکی ابتدا و اولیت میں وہ اختلافات جو اہلِ ہند نے کئے ہیں۔ جو طرح طرح کے ملحدوں نے کئے ہیں۔ جو کچھ اس باب میں اہلِ شرع سے وارد ہے۔ اور جو اربابِ مذاہب و ادیان پر اترا ہے یہ سارے مسائل و مباحث ہم اس کتاب میں پہلے ہی بیان کر چکے ہیں۔

ملکی و قومی مسائل اس کے بعد ہم نے ان سلاطین کے حالات لکھے ہیں جو گذر چکے ہیں۔ اُن اقوام کے واقعات لکھے ہیں جو تباہ ہو چکی ہیں۔ اُن صدیوں کے تذکرے کئے ہیں جن کی حدود تک پہنچنے میں خلا حائل ہے۔ اُن جماعتوں کے اخبار و افکار بتلائے ہیں جن کو تباہ ہوئے ایک زمانہ ہو چکا۔ اور یہ ساری باتیں ترتیب ایام و وقات کے ساتھ سلسلہ وار بیان کی ہیں۔ مثلاً قوم عاد کے بادشاہ اور فرعون خسرو اور کسریٰ۔ یونان و اہلِ یونان۔ جو حکمت و فلسفہ ان اقوام سے ظاہر ہؤا جو اقوال و مذاہب فلاسفہ سے مروی ہیں۔ جو خبریں بادشاہوں سے متعلق ہیں۔ جو حالات عناصر و اقوام سے علاقہ رکھتے ہیں۔ پھر اس ذیل میں انبیاء و مرسلین و اتقیا و صلحا کے

حالات۔ تا آں کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے فضل و کرم سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو شرف رسالت عطا فرمایا۔ ہم نے ان سب کی تفصیل درج کی ہے۔

اسلامی واقعات { آنحضرت کی ولادت۔ نشو و نما۔ بعثت و ہجرت۔ غزوات و سرایا، مہمات تا بہ ایام وفات و اتصال، خلافت و تنظیم مملکت۔ کہ ہر ایک زمانہ میں اس کی کیا کیفیت تھی۔ آل ابو طالب بن عبدالمطلب (طالبیین کے مقاتل یعنی وہ لوگ کہ اس نسل میں سے اُٹھے ظاہر ہوئے اور پھر قتل (شہید) ہوگئے۔ تا بہ عہدِ خلافت امیرالمومنین المتقی اللہ کہ ۳۳۲ھ کا زمانہ ہے۔ اور یہی اس کتاب (مروج الذہب) کی تصنیف کا سن ہے۔ غرضکہ ان حقائق میں سے کوئی ایک جزئیہ بھی اس کتاب میں فرو گذاشت نہ ہونے پایا۔

کتاب الاوسط مروج الذہب کا سبب تالیف

اخبار الزمان سے فارغ ہو کر ہم نے کتاب الاوسط تصنیف کی۔ پھر یہ رائے ہوئی کہ ہماری تاریخ اعظم و کتاب الاوسط کے بعد سے اب تک کے واقعات میں ایک مستقل کتاب لکھی جائے۔ جس میں ہماری دونوں اعظم و وسط کتابوں کا خلاصہ ہو۔ اور اس لطیف تصنیف میں اُن دونوں کتابوں کے علاوہ علوم و اخبار اقوام گذشتہ ایام برر فتہ کی جو باتیں ہنوز کہیں ودیعت نہیں ہوئیں وہ یہاں قید تحریر میں لائی جائیں لیکن تقصیر و تقاعد و غفلت ہو جائے۔ تو اس سے معذرت ضروری ہے۔ کہ سیر و سفر و سیاحت میں لگے

رہنے سے خیالات بھی بوڑھے ہو گئے۔ اور دل بھی ڈوب گیا۔

مسعودی کی سیاحت } گاہے سمندر میں گزرتی ہے۔ اور گاہے پشت زمین پر بسر ہوتی ہے۔ اقوام کے نوادر کا مشاہدہ کرنا پڑتا ہے۔ اقالیم کے خواص کا خود معاینہ کر کے جانچ کرنی پڑتی ہے۔ مثلاً ہمارا سفر سندھ۔ زنگبار۔ صنف۔ چین۔ رانج۔ مشرق و مغرب کی سیاحت کو کبھی تو اقصائے خراسان میں ہیں۔ کبھی وسط آرمینیا اور آذربائیجان میں ہیں۔ کبھی سواحت وطالقان میں ہیں۔ کبھی عراق میں ہیں کبھی شام میں ہیں۔ گویا جس طرح کسی نے کہا ہے۔ میری سیاحت کہ آفاق میں ہے۔ ایسی ہی سیاحت آفتاب کی اشراق میں ہے۔

تیمم اقطار البلاد فتارۃ ❊ لدی شرقہا الاقصے وطوراً الی الغرب

(اس نے تمام اقطار و اطراف زمین کے گشت کا ارادہ کر لیا ہے۔ اور یہی باعث ہے کہ کبھی تو مشرق اقصےٰ میں ہوتا ہے اور کبھی مغرب میں۔)

مری الشمس لا ینفک تقذفہ النویٰ ❊ الیٰ اُفقٍ ناءٍ یقصر بالرکب

(وہ ہمیشہ آفتاب کی طرح چلتا ہی رہتا ہے۔ ابھی اس کنارہ پر تھا۔ ابھی دوسرے کنارہ پر پھینک دیا گیا۔ یہ ایسی چال ہے۔ کہ قافلہ کے سوار بھی اس کا ساتھ دینے سے قاصر ہیں)

سیاحت کے خصائص نوعی } پھر خالی سفر ہی نہیں طرح طرح کے سلاطین و ملوک کے متعلق غور کرنا اور نتیجہ صحیح نکالنا باوصف اس کے کہ وہ خود ہلاک ہو چکے ہیں

ان کے اخلاق و آداب کے آثار تک باقی نہیں۔ اُس کی ہمتوں اور حوصلوں میں جو تضاد تھا۔ ان کے ممالک میں جسقدر فاصلہ ہے۔ ان سب کو ملحوظ رکھنا اور ہر ایک کا مسلک جانچنا اور قرار دینا یہ کوئی سرسری امور نہیں۔

انقلاب روزگار لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ علم کے آثار مِٹ گئے۔ علمی روشنی کے منارے گر گئے۔ غبی و بلید تو بہت ہیں۔ مگر ذی فہم تھوڑے ہی رہ گئے ہیں۔ حتیٰ کہ اب جسے دیکھو وہ بنادٹی ہوگا۔ جاہل ہوگا۔ عطائی یا دخیل ہوگا۔ ناقص ہوگا۔ جو ظن وگمان و حدس و تخمین پر قانع ہے۔ اور علم و یقین سے اندھا ہوگیا ہے۔ بایں ہمہ علوم کے اس صنف میں لوگ مشغول رہتے چلے آئے ہیں۔ اور آداب کے اس فن کے لئے اپنے آپ کو خاص بھی کرتے رہے ہیں۔ تا آنکہ ہم نے اپنی کتابیں مختلف مضامین اور گوناگوں مذاہب کے متعلق تصنیف کیں۔ مثلاً:۔

مذہبی تصنیفات (۱) کتاب الابانہ عن اصول الدیانہ اس میں مذہب کے اصول بیان کئے ہیں۔

(۱) کتاب المقادیر فی اصول الدیانات۔ اس میں اصول مذاہب کے متعلق نقداری بحث ہے۔

(۲) کتاب سرالحیات یعنی زندگی کا راز کیا ہے۔

(۳) نظر الادلہ فی اصول الملہ۔ اس کتاب میں بہت سے لطیف مباحثے ہیں مثلاً اصول۔ فنون۔ قوانین احکام۔ قیاس کا یقینی ہونا۔ احکام میں اجتہاد۔ رائے و استحسان کا وقوع۔ ناسخ و منسوخ کی پہچان۔ کیفیت و ماہیت اجماع

معرفت خاص و عام۔ اوامر و نواحی۔ منع و حرمت، واباحت احادیث جن سے استفاضہ ہوتا ہے۔ آحاد۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال کہ اسی ضمن میں اصول فتوٰی و مناظرہ مخالفین بھی ہے۔ جن جن باتوں میں لوگوں نے ہم سے مناظرے کئے تھے اور جن کے بعض حصّوں میں وہ ہم سے متفق ہو گئے ان کے واقعات بھی دیئے ہیں۔

(۴) الاستبصار فی الامامتہ۔ یہ مسئلہ امامت و خلافت کی بحث میں ہے اس باب میں ارباب نص و تاریخ کے جو اقوال ہیں۔ جو لوگ امامت کے متعلق نص کے قائل ہیں۔ اور جو واقعات کی بناء پر اس کے منکر ہیں۔ اس میں ہر ایک فریق کے مفصّل دلائل مذکور ہیں۔

(۵) الصفوۃ فی الامامتہ۔ یہ بھی امامت کی بحث میں ہے۔

علمی تصنیفات } اس کے علاوہ ہماری دوسری تمام کتابیں جو علوم ظاہر و باطن و مخفیات و ماضیات کے متعلق ہیں جن کے ذریعہ سے ہم نے طبیعتوں کو اس حد تک بیدار کیا ہے جس حد تک کہ ترقی کرنیوالے ترقی کر سکتے ہیں۔ اور محدثین ایسی ترقی کے متوقع ہیں مثلاً وہ باتیں جو اہل علم نے اُن چمکتی ہوئی روشنیوں کے باب میں کہی ہیں کہ زمین پر اُن کی چمک دکھائی دیتی ہے۔ اور قحط سالی و خوش حالی کے زمانوں میں وہ بھی پھیلتی ہیں اور بسط پذیر ہوتی ہیں۔ اسی طرح وہ مسائل جو فتنہ و فساد و جنگ و جدال کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ جن کے واقعات و حالات ظاہر ہوا کرتے ہیں! ور ان کے اوائل کی حقیقت کھلی کھلی روشن و مستنیر ہوتی ہے۔ غرضکہ

ہماری تمام باقی کتابیں بھی جو سیاست کے مباحث و مطالب میں ہیں وہ بھی ایسی ہی ہیں۔ مثلاً:۔

بعض مصنفات علمیہ (۶) کتاب السیاحتہ المدنیّہ۔ تمدن و تہذیب کے بیان میں۔

(۷) اجزاء المدنیّہ۔ تمدن و تہذیب کی علمی و فلسفی تقسیم۔

(۸) الاجزاء الطبیعتہ۔ فزیکل سائنس ہیں۔

(۹) انقسام الاجزاء۔ سائنس کی تعمیل ہیں۔

(۱۰) تکوّر المدنیّہ۔ تمدن کیوں کر خراب ہو جاتا ہے۔

(۱۱) تکوّر الطبیعتہ۔ سائنس میں کیوں کر خرابی آتی ہے۔

(۱۲) انقسام اجزاء المدنیّہ۔ مذہب و قوم کا شیرازہ کیونکر بکھرتا ہے۔

(۱۳) الابانتہ عن المواد۔ روئے زمین پر اصلی مادے کیا کیا اور کون کون سے ہیں۔

(۱۴) کیفیت و ترکیب العوالم اس کتاب میں بتایا ہے۔ کہ عالم کی ترکیب کن کن اجزاء سے ہے۔ اجرام افلاک کیا ہیں۔ ان میں کون کون سے محسوس اور کون کون سے غیر محسوس ہیں۔ کن کن میں کثافت ہے۔ کن کن میں لطافت ہے اور اہل مذاہب نے اس باب میں کیا کیا باتیں کہی ہیں۔

یہ کتاب (مروج الذہب) تاریخ میں ہے۔ واقعات عالم میں سے زمانہ ماضیہ کے تذکرے میں ہے کہ کیسے کیسے پیغمبر۔ کیسے کیسے بادشاہ گذرے ہیں۔ جن کی سیرتیں کس کس نہج کی تھیں۔ اسی طرح اقوام و ممالک کے حالات

ہیں ہے۔ کہ کون کون سی قومیں کن کن ملکوں میں آباد ہوئیں۔ اور انہوں نے کیا کیا آبادیاں بسائیں۔

اس کتاب کی تالیف سے میری ایک غرض تو یہ ہے۔ کہ اہل علم و ارباب حکمت نے تصنیف و تالیف سے جو مقصد رکھا ہے۔ مجھے اُس سے محبت ہے۔ اور میں اُس کی پیروی کرنا چاہتا ہوں۔ دُوسرا مدعا یہ ہے کہ عالم میں اس تالیف کے ذریعہ سے ایک عمدہ یادگار قائم ہو۔ اور عہدِ قدیم کا ایک مرتب علم موجود رہے۔

مصنفین کی ہم نے مختلف حالتیں پائی ہیں بعض تو بہ کمال جودت اپنے فرض سے عہدہ برآ ہوئے ہیں بعض کوتاہ دست نکلے ہیں بعض منتہی ہیں کہ پوری پوری باتیں بیان کرتے ہیں بعض اختصار کے خوگر ہیں۔ ہم نے واقعات بھی جانچے ہیں۔ کہ جتنے دِن زیادہ ہوتے گئے۔ اُتنے ہی وہ بھی زیادہ ہوتے گئے۔ اور نئے نئے زمانے میں نئے نئے حالات نکلتے آئے بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ ایک ماہر فن تاریخ ایک دُوسرے ذکی وفطین مورخ کی عیب گیری کرتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو شخص جتنی توجہ کریگا اپنے ذوق و عمل کے مطابق اُسی تناسب سے بہرہ ور ہو گا۔ ہر شخص کا ایک خاص حصہ ہے۔ جو اُسی سے مخصوص ہے۔ جو اپنے ہی وطن میں گوشہ گزیں ہو اور اپنی ہی اقلیم کے واقعات پر قانع رہے۔ وہ ایسے وسیع النظر کا ہم پایہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ جس نے جہاں گردی کے لئے اپنی زندگی منقسم کر دی ہو اور سیاحت اقطار ارض کی غرض سے اپنے ایام عمر تقسیم کر ڈالے ہوں۔

سفر کے مصائب برداشت کر رہا ہو۔ ہر ایک دقیق امر کا اُس کے خاص معدن سے استخراج و استنباط کرتا ہو۔ اور ہر ایک نفیس شے کو اُس کے منبع و مخزن سے نکالتا ہو۔

قدمائے مورخین تاریخ اور واقعات میں متقدمین و متاخرین نے بہت سی کتابیں تالیف کیں۔ ان میں بعض تو پُورے اُترے۔ اور بعض نے غلطیاں کیں۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ ہر ایک نے خواہ وہ مُصیب ہو یا مخطی۔ انتہا درجہ کی امکانی کوششیں کیں۔ اور تصنیفات میں اپنی فطانت کے پوشیدہ جواہر نمایاں کئے مثلاً

(۱) وہب بن منبّہ
(۲) ابو مخنف لوط بن یحییٰ العامری
(۳) محمد بن اسحاق
(۴) واقدی
(۵) ابن الکلبی
(۶) ابو عبیدہ
(۷) معمر بن المثنیٰ
(۸) ابوالعباس ہمدانی
(۹) ہیثم بن عدی الطائی
(۱۰) مشرقی بن القطامی
(۱۱) حماد راویہ
(۱۲) اصمعی
(۱۳) سہل بن ہارون
(۱۴) عبداللہ بن المقنع
(۱۵) یزیدی
(۱۶) محمد بن عبداللہ العتبی
(۱۷) آمدی
(۱۸) ابو زید سعید بن اوس الانصاری
(۱۹) نضر بن شمیل
(۲۰) عبداللہ بن عائشہ
(۲۱) ابو عبیداللہ القاسم بن سلام
(۲۲) علی بن محمد المدائنی

(۲۳) عمار بن ربیع بن سلمہ
(۲۴) محمد بن سلام الجمحی
(۲۵) ابو عثمان عمرو بن عمر الجاحظ
(۲۶) ابو زید عمرو بن شبیبۃ النمیری
(۲۷) نور فی انصاری
(۲۸) ابو سائب مخزومی
(۲۹) علی بن محمد بن سلیمان النوفلی
(۳۰) زبیر بن بکار

(۳۱) انجیلی
(۳۲) ریاشی
(۳۳) ابن عائدہ
(۳۴) عمار بن وسیمۃ المصری
(۳۵) عیسیٰ بن لہیعۃ المصری
(۳۶) عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن عبدالحکم المصری
(۳۷) ابو حسان الزیادی
(۳۸) محمد بن عیسیٰ الخوارزمی

مؤرخین ما بعد

(۳۹) ابو جعفر محمد بن ابی السری
(۴۰) محمد بن الہیثم بن شبابۃ الخراسانی مولف کتاب الدولۃ
(۴۱) اسحاق بن ابراہیم الموصلی مولف کتاب الاغانی وغیرہ
(۴۲) خلیل بن الہیثم الخرثمی مصنف کتاب الحیل کتاب المکائد فی الحروب وغیرہ
(۴۳) محمد بن یزید المبرد الازدی
(۴۴) محمد بن سلیمان المنقری الجوہری

(۴۵) محمد بن زکریا العلائی المصری مصنف کتاب الاجواد وغیرہ
(۴۶) ابن ابی الزمینی مؤدب معلم واتالیق امیر المومنین المکتفی باللہ العباسی خلیفہ بغداد
(۴۷) احمد بن محمد الخزاعی المعروف بالخاقانی الانطاکی۔
(۴۸) عبداللہ بن محمد بن محفوظ البلدی الانصاری رفیق ابو یزید عمارہ بن زید الیمنی۔

(۴۹) محمد بن البرقی بن خالد الرقی الکاتب مصنف کتاب التبیان۔

(۵۰) احمد بن محمد بن خالد البرقی

(۵۱) احمد بن ابی طاہر مصنف اخبار بغداد وغیرہ۔

(۵۲) ابوالوشاء

(۵۳) علی بن مجاہد مصنف اخبار الاموین وغیرہ۔

(۵۴) محمد بن صالح بن النطاح مصنف کتاب الدولۃ العباسیہ وغیرہ

(۵۵) یوسف بن ابراہیم مصنف کتاب اخبار ابراہیم المہدی وغیرہ

(۵۶) محمد بن الحارث الثعلبی مصنف اخبار الملوک جو فتح بن خاقان وزیر کے لئے تصنیف ہوئی تھی۔

(۵۷) ابو سعید السکری مصنف کتاب ادبیات العرب۔

ایک نامور مورخ (۵۸) عبد اللہ بن حسن بن داریہ ایک ایسے نامور مورخ تھے۔ کہ تالیف میں اُن کو امامت کا درجہ حاصل تھا۔ اُن کی تصنیف کمال ملاحت کا نمونہ تھی۔ طرح طرح کے مسائل وامور میں اُنہوں نے کتابیں تصنیف کیں۔ جس کو اُن پر اعتماد تھا۔ اُس نے اُن کا اتباع کیا۔ اُن سے فوائد حاصل کیئے اُن کی پیروی کی اور اُن کے نقش قدم پر چلتا رہا۔ یہ دعویٰ بے دلیل باور نہ آئے اور اس کی صحت مطلوب ہو۔ تو ابن داریہ کی تاریخ کبیر دیکھو۔ جو اُن تمام کتابوں سے زیادہ اپنے حدود کی جامع ہے۔ نظم و ترتیب میں سب سے انوکھی شکل رکھتی ہے۔ سب سے بہتر معلومات اُس سے حاصل ہوتی ہیں۔ واقعات اقوام وسلاطین عجم اور ان کے حالات سیرت میں یہ کتاب اجمع الجوامع ہے۔

ابن داریہ کی نفیس کتابوں میں ایک "المسالک والممالک" بھی ہے۔ جو علم جغرافیہ میں ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کتابیں ہیں۔ جو تلاش کرنے پر مل جاتی ہیں۔ اور مطالعہ کرنے پر اُن کی تعریف کرنی پڑتی ہے۔

چند جامع تاریخیں

(۵۹) محمد علی کی کتاب التاریخ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے۔ لے کر آں حضرت کی وفات تک کے واقعات ہیں۔ پھر آنحضرت علیہ السلام کے بعد سے خلفاء وسلاطین کے حالات معتضد باللہ عباسی کے عہد خلافت تک بیان کئے ہیں۔ ہر ایک خلیفہ یا بادشاہ کے زمانہ میں جو جو اور جیسے ماجرے پیش آتے رہے۔ یہ کتاب سب کی جامع ہے۔ اور سب کے حالات اس میں مذکور ہیں۔

(۶۰) احمد بن علی البلاذری کی کتاب النسب قبائل عرب اور اُن کے خاندانوں کے تذکرہ میں ہے اور بلاذری کی کتاب البلدان جس میں شہروں اور ملکوں کی فتوحات کے حالات ہیں کہ کون کون سے مقامات بذریعہ صلح مسخر ہوئے اور کون کون سے بزور شمشیر مفتوح ہوئے۔ اس کی ابتداء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے کی ہے۔ اور آنحضرتؐ کے عہد مبارک میں جو مقامات فتح ہوئے تھے۔ پہلے ان کا بیان ہے۔ پھر خلفائے مابعد کی عہد بہ عہد فتوحات کا ذکر ہے۔ اس ذیل میں جتنے واقعات پیش آئے ہیں۔ سب کی تشریح کی ہے۔ اور مشرق ومغرب وجنوب کے تمام زیر نظر مقامات کی کیفیت بھی بیان کردی ہے۔ ہم کو معلوم نہیں کہ فتوح البلدان میں اس سے

بہتر کتاب بھی کسی نے لکھی ہے۔

(۶۱) داؤد بن جراح کی "التاریخ الجامع" جو ایرانیوں کے اکثر حالات کی جامع ہے۔ اور اُن کے علاوہ دوسری اقوام کے حالات بھی دیئے ہیں۔ یہ مصنّف دولتِ عباسیہ کے وزیر اعظم علی بن عیسیٰ بن داؤد بن الجراح کا دادا تھا۔

(۶۲) ابوعبداللہ محمد بن الحسن بن الفراء المعروف بہ خواہر زادہ عیسیٰ بن برخان شاہ (افرخان شاہ) کی تاریخ میں ہر ایک زمانہ کے گوناگوں واقعات اور بوقلموں حالات جمع ہیں۔ جو اسلام سے پہلے گذرے تھے۔ یا جو اسلام کے بعد وقوع پذیر ہوئے ہیں۔ یہ کتاب ۳۲۰ھ میں تصنیف ہوئی۔ اور اس سن تک کے واقعات اس میں مذکور ہیں۔

(۶۳) ابوعیسیٰ بن المنجم کی تاریخ جس میں پیغمبروں اور بادشاہوں کے واقعات حسب روایت تورات لکھے ہیں۔ اور ان پر اضافہ بھی کیا ہے۔

(۶۴) عبدالرحمٰن بن خالد بن ہشام الاموی کی تاریخ جو بنی اُمیّہ کے حالات میں ہے۔ کہ اس میں اُن کے فضائل و مناقب بیان کئے ہیں اور دکھایا ہے کہ دُوسروں سے وہ کن کن مراتب میں ممتاز ہیں۔ اور اپنے زمانہ میں اُنہوں نے کیا کیا کام کیے ہیں۔ اور اُن کی سیرتیں کیسی تھیں۔

(۶۵) قاضی ابوبشر دولابی کی تاریخ۔

(۶۶) محمد بن خلف بن وکیع کی تاریخ جو ایک قابل عزت کتاب ہے اور جس کے مصنّف قاضی تھے۔

(۶۷) محمد بن خالد الہاشمی کی تاریخ "السیر والاخبار"۔

(۶۸) اسحاق بن سلیمان الہاشمی کی تاریخ "السیر والاخبار"۔

(۶۹) ابوبکر محمد بن زکریا رازی کی کتاب "سیر الخلفاء" یہ مصنف طبیب بھی تھا۔ اور طب میں "منصوری" وغیرہ اس کی متعدد کتابیں ہیں۔

(۷۰) عبداللہ بن مسلم بن قتیبۃ الدنیوری جن کی بکثرت کتابیں اور بہت ہی وسیع ترین تصنیفات ہیں مثلاً ان کی کتاب "المعارف" اور اسی طرح کی دوسری کتابیں۔

بعض ماہرین فن

(۷۱) ابن جریر۔ ابوجعفر محمد بن جریر الطبری کی تاریخ سب سے بہتر ہے۔ جتنی کتابیں تصنیف و تالیف ہوئیں۔ یہ ان سب پر فوقیت رکھتی ہے۔ انواع اخبار کی جامع۔ فنون آثار پر حاوی۔ اصناف علم پر مشتمل۔ بہت ہی سود مند۔ کثیر الافادہ کتاب ہے۔ کہ اس سے نفع بخش معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اور ایسا ہونے میں کوئی تعجب بھی نہیں۔ کیونکہ اس تاریخ کے مولف اپنے زمانہ کے فقیہ اور علامۂ دہر تھے۔ فقہائے روزگار و حاملین احادیث و آثار کے علوم کی انتہا انہیں تک ہے یعنی فقہ اور حدیث و تاریخ کے وہ اتنے بڑے عالم تھے۔ کہ تمام دوسرے علمائے عہد انہیں کے بیان سے سند لیتے تھے۔

(۷۲) نفطویہ۔ ابوعبداللہ ابراہیم بن محمد بن عرفۃ الواسطی النحوی نے بھی یہی روش اختیار کی ہے۔ اور ان کا لقب نفطویہ تھا۔ اور یہ علم نحو میں بھی فاضل تھے۔ ان کی تاریخ ملاحت اور فوائد سے لبریز ہے۔ اور خواص اہل علم

دوسروں ان فن کے لطائف معلومات کی بہترین شان رکھتی ہے۔ وہ اپنے زمانہ میں سب سے اچھے مؤلف اور سب سے زیادہ ملیح التصنیف تھے۔

(۷۳) صولی۔ محمد بن یحییٰ الصولی بھی اسی زمرہ میں ہیں۔ اور اُن کی کتاب الاوراق بھی اسی قبیل کی ہے۔ جس میں خلفاء بنی عباس۔ خلفاء بنی امیہ شعرائے عہد دولت عباسیہ وامویہ۔ اور ان دونوں سلطنتوں کے وزراء وارکان دولت کے حالات ہیں۔ اس میں ایسی ایسی انوکھی باتیں بیان کی ہیں جن سے تمام دوسرے مؤرخ قاصر ہیں۔ کتنے ہی امور واشیاء ہیں جن کے بیان میں وہ منفرد ہیں۔

(۷۴) لاحقین بہ سابقین۔ ابوالقاسم جعفر بن محمد بن حمدان الموصلی الفقیہ نے اپنی تاریخ "کتاب الاخبار" کے ذریعہ سے کتاب "الروضہ" کا معاوضہ کیا ہے۔ اور "الباہر" اس کا لقب رکھا ہے۔

(۷۵) ابراہیم بن ماموبہ الفارسی نے "مبرد" کی کتاب "الکامل" کے معاوضہ میں اپنی تاریخ تصنیف کی ہے۔

(۷۶) ابراہیم بن موسیٰ الواسطی الکاتب نے محمد بن داؤد الجراح کی اخبار الوزراء کے معاوضہ میں ایک دوسری "اخبار الوزراء" لکھی ہے۔

(۷۷) علی بن الفتح الکاتب المعروف بالمطوق جنہوں نے متعدد وزرائے خلیفۃ المقتدر باللہ العباسی کے حالات لکھے ہیں۔

(۷۸) مؤرخ مصری۔ مؤلف تاریخ زہرۃ العیون وجلاء القلوب۔

(۷۹) عبدالرحمٰن بن عبدالرزاق المعروف بالجوزجانی السعدی مؤلف تاریخ!

(۸۰) ابو ذکوۃ الموصلی مؤلف تاریخ موصلی

(۸۱) احمد بن ابی یعقوب المصری مؤلف "اخبار العباسیین"

(۸۲) عبد اللہ بن الحسین بن سعد الکاتب مؤلف اخبار الخلفاء بنی العباس وغیرہم۔"

(۸۳) محمد بن مزید بن ابی الازہر مؤلف کتاب "الہراج والاحداث"۔

ایک مؤرخ نما دخیل } میں نے دیکھا۔ کہ سنان بن ثابت بن قرۃ الجرجانی نے وہ فن اور وہ طریقہ اختیار کیا۔ جو اس کا فن اور اس کا طریقہ نہ تھا۔ بلکہ وہ اس میں دخیل بننا چاہتا تھا۔ اس نے ایک کتاب تالیف کر کے اپنے ایک انشاپرداز اباب صاحب قلم دوست کو بھیجی۔ جس کی ابتداء میں اخلاق کے جامع مباحث ہیں۔ آداب نفس کے تذکرے ہیں۔ نفس کی تین قسمیں ہیں (۱) نفس ناطقہ (۲) نفس غضبیہ (۳) نفس شہوانیہ۔ سیاست اور تمدن کے مسائل بھی ایسے ہی لکھے ہیں۔ جیسے افلاطون نے اپنی کتاب "السیاستہ المدنیہ" میں لکھے تھے۔ کہ اس کے دس مقالے ہیں۔ اس پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ کہ بادشاہ اور وزیروں پر کیا کیا واجب ہے۔ اور ان کے فرائض کیا ہیں۔ اس کے بعد تاریخ لکھنی شروع کر دی ہے۔ جس میں ایسے واقعات بھرے ہیں۔ کہ دیکھے تک نہ تھے۔ مگر فی زعمہ یہ سب اس کے نزدیک صحیح و درست ہے۔ اس سلسلہ کو خلیفہ المعتضد باللہ کے واقعات سے ملا دیا ہے۔ اور اپنا تذکرہ بھی کیا ہے۔ کہ خلیفہ کی صحبت میں اس کے پچھلے دن کیسے گذرے۔ یہ لکھ کر اور بھی ترقی کی ہے۔ کہ ایک ایک خلیفہ کی

"تاریخ لکھی ہے۔ لیکن تاریخ کا جو طریقہ ہے اور مؤلفین کا جو انداز ہے یہ کتاب ان سب سے الگ ہے۔ بلکہ سب کی ضد ہے۔

"ثابت بن قرہ کی تاریخ تو فی نفسہٖ اچھی ہے۔ اور معانی تاریخ کے دائرہ سے باہر نہیں ہے۔ مگر عیب یہ ہے کہ وہ اپنے مرکز فن سے باہر نکل آیا۔ اور بہ تکلّف ایسا کام شروع کیا۔ جو اُس کا پیشہ نہ تھا۔ جس علم میں وہ منفرد و یکتا مانا جاتا تھا۔ مثلاً علم اقلیدس۔ معظمات مجسطی۔ مقدرات اگر ان معلومات کو لیتا اور سقراط و افلاطون و ارسطو سے افتتاح کرتا۔ اشیائے فلکیہ۔ آثار علویہ۔ امزجہ۔ طبیعیہ۔ نسبت۔ تالیفات۔ نتائج۔ مقدمات صنائع مرکبات۔ معرفت طبیعیات۔ الٰہیات۔ جواہر۔ ہیئیات۔ مقدار اشکال وغیرہ۔ انواع فلسفہ کے مسائل لکھتا تو اس تکلّف سے بچ جاتا۔ اور ایسا کام کیئے ہوتا۔ جو اس کے شایانِ شان سمجھا جاتا۔ لیکن اپنی قدر کے جاننے والے کہاں۔ کہ منزلت شناس تو مفقود ہیں۔

عبداللہ بن مقفع کا مقولہ ہے۔

"جس نے کوئی کتاب تصنیف کی۔ اس نے اپنے آپ کو تیروں کا آماجگاہ بنایا۔ اگر کتاب اچھی ہوئی تو جو پائے عزّت قرار پایا۔ اور اگر بُری ہوئی تو جو عزت تھی اُس کو بھی گنوایا۔

محدثین و علمائے رجال ہم نے اس میں صرف انہیں "تاریخوں کا ذکر کیا ہے۔ جن کے مصنفین و مؤلفین مشہور ہیں۔ وہ تاریخیں قصداً ترک کر دی گئی ہیں۔ جو محدثین نے اسمائے رجال

و حدیث دریافت کرنے کے لئے لکھی ہیں۔ اور اُن کے زمانے اور طبقات ظاہر کئے ہیں۔ کیونکہ یہ ہمارے موضوع کلام سے جسے اس کتاب میں ہم لانا چاہتے ہیں۔ ایک زائد امر ہے۔ اس لئے کہ حاملان آثار و احادیث و ناقلان سیر و اخبار نبوی و طبقات اہل علم۔ صحابہ و تابعین اور ہر عہد کے بزرگوں کے حالات بہ اختلاف انواع و تنازع آراء جن میں فقہائے و اہل الرائے و ارباب مذاہب و متکلمین سب شامل ہیں۔ تا بہ ۳۳۲ھ ہم اپنی تصنیف اخبار الزمان و کتاب الاوسط میں درج کر چکے ہیں۔

مبادی } بہ لحاظ نفاست مضامین و اہمیت مطالب کہ جن خاطر و خیالات عظیمہ پر یہ کتاب حاوی ہے۔ وہ معنوی طور پر ہماری گذشتہ کتابوں کے طالع کامل پر مشتمل ہے۔ اور ہماری تالیفات کی روشن تلمیحات اس میں ہیں۔ میں نے اس کتاب کا نام "مروج الذہب و معادن الجواہر" رکھا ہے جس کے معنے ہیں "سونے کے مرغزار اور جواہرات کی کانیں"۔

اس کتاب کی خصوصیت } میں نے اس کتاب کو شرفائے ملوک و اہل نظر کے لئے تحفہ قرار دیا ہے۔ کہ جو ضرورتیں داعی ہوتی ہیں۔ اور طبیعتوں کو جن معلومات کے فراہم کرنے میں انہماک ہوتا ہے۔ وہ سب اس میں ہیں اور جو کچھ پہلے گذر چکا ہے اُسکی درایت کا یہ وسیلہ ہے۔ ہماری مصنفات سابقہ کے جو مقاصد ہیں وہ بھی اس کتاب میں شامل ہیں۔ اور ایسے جامع امور بھی ہیں۔ جن کا جاننا ایک دانشمند ادیب کے لئے موجب زینت ہے۔ اور جن سے تغافل برتنے میں ان کو کبھی

معذور نہیں قرار دیا جا سکتا۔ غرض کوئی نوع علم۔ کوئی صنف خبر اور کوئی طریق اثر ایسا نہ ہوگا جس کا تذکرہ تفصیلاً یا اجمالاً یا اشارۃً اس کتاب میں نہ ہو یا کم سے کم فحوائے کلام ہی سے اُس کی جانب ایما نہ ہوتا ہو۔

انذار کوئی شخص اگر اس کتاب میں کچھ تحریف کرے۔ یا اس کی بنیاد میں سے کوئی رکن ہٹا دے۔ یا کسی امر واضح کو تاریک بنا دے یا عنوانات میں اشتباہ ڈال دے۔ یا تغیر کرے۔ یا بدل دے۔ یا اپنی طرف سے کچھ بھر دے یا مختصر کر دے۔ یا ہمارے سوا کسی دوسرے کی جانب اس کو منسوب کرے تو خدا کا وہ غضب۔ وہ عذاب۔ وہ بلا اُس پر نازل ہو جس کے مقابلہ سے اُس کی قوتِ صبر و تحمل عاجز آئے۔ تخیل و قفِ حیرت ہو جائے۔ خدا اُس کو سارے جہان کے لئے مُثلہ بنائے (مُثلہ وہ شخص جس کے ناک کان وغیرہ کاٹے گئے ہوں) اور عبرت اندوزوں کے لئے سرمایہ عبرت قرار دے اور تعزیر کی وہ ایک نشانی ہو۔ قدرت کاملہ نے جو کچھ اُسے عطیہ دیا ہو۔ سب چھین لے اور قوت و نعمت کے جو انعامات اسے ملے ہوں۔ بدیع السموات والارض اُن سب کے درمیان حائل ہو جائے۔ خواہ وُہ کسی مذہب و ملت و عقیدہ کا کیوں نہ ہو۔ اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

اس کتاب کی ابتداء و انتہا دونوں اسی تخویف پر مشتمل ہیں۔ کہ ہوا و ہوس یا شقاوت جس پر غالب ہو اُس کو روک سکے۔ ایسے شخص پر لازم ہے کہ اپنے پروردگار کے حکم کو نگاہ میں رکھے۔ اور انقلاب حالت سے ڈرتا اور بچتا رہے۔ کہ مدت عمر قلیل۔ مسافت قصیر اور جانا خدا کے پاس ہے۔٭

اب وقت ہے کہ اس کتاب کے جو ابواب ہیں۔ اور ہر باب جن جن مضامین پر حاوی ہے اُن سب کا اجمالی تذکرہ کر دیا جائے۔

ابواب کتاب } آغاز کتاب میں ہم نے اس تصنیف کے اغراض بیان کر دیئے ہیں۔ اب اس کے تمام ابواب وفصول کی حسب ترتیب و مدارج استحقاق تشریح کئے دیتے ہیں کہ خواہشمندوں کے لئے یہ کتاب قریب التناول ہو جائے یعنی بآسانی وہ اس کو پڑھ سکیں کہ کن کن مطالب کا اس تصنیف نے احاطہ کر رکھا ہے:-

(۱) سر آغاز آفرینش۔ شانِ تکوین۔ مخلوقات کا پیدا ہونا۔ اور پراگندہ ہو جانا۔ از آدم تا بہ ابراہیم علیہما السلام۔

(۲) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعات۔ انبیا و ملوک۔ ما بعد کے حالات۔ جو بنی اسرائیل میں ہوئے۔

(۳) ارخبعم بن سلیمان بن داؤد کی سلطنت۔ بنی اسرائیل کے ملوک۔ مابعد کی کیفیت۔ اسرائیلی پیغمبروں اور بادشاہوں کے تذکرے۔

(۴) تذکرہ اہلِ فترت یعنی وہ لوگ جو مسیح علیہ السلام کے بعد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے پہلے گذرے۔

(۵) ہندوستان کے حالات۔ ارباب ہندوستان کے حالات۔ اُن کے ملوک اور ممالک کی مدتیں۔ اُن کی سیرتیں۔ عبادات میں اُن کے اعتقادات۔

(۶) کرہ ارض۔ سمندر۔ نہروں اور پہاڑوں کا مبدء۔ ہفت اقلیم اور جو کواکب اُن سے متعلق ہیں۔ وغیر ذالک۔

(۷) سمندروں کا منتقل ہو جانا اور بڑی بڑی نہروں اور دریاؤں کا بیان۔

(۸) بحر حبش کے حالات اور جو باتیں اُس کی مقدار۔ اُس کے شعبوں اور اُس کی خلیجوں کے متعلق بیان کی گئی ہیں۔

(۹) مدّ و جزر میں لوگوں کے مباحثات اور اس ذیل میں جو کچھ کیا گیا ہے اُس کا مجموعہ۔

(۱۰) بحیرۂ روم اور اُس کے طول و عرض و ابتداء و انتہا کے متعلق اقوال۔

(۱۱) بحر نیطش و بحرِ مانطش و خلیج قسطنطنیہ۔

(۱۲) بحر باب۔ بحیرۂ خزر۔ بحر جرجان۔ اور تمام سمندروں کا ترتیبی بیان۔

(۱۳) تذکرہ سلاطین چین و ترک۔ نسل عابور کا متفرق ہو جانا حالات چین و ملوک چین۔ جامعۂ سیرت و سیاست۔

(۱۴) سمندروں میں اور اُن کے ارد گرد کیا کیا عجائب ہیں کون کون سی قومیں ہیں۔ بادشاہوں کے مراتب و مدارج۔ وغیر ذالک۔

(۱۵) تذکرہ جبل الفتح۔ و اقوام لان و سریر۔ و انواع ترک و بلغار و ذکر باب و ابواب۔ اور جو بادشاہ اور قومیں ان کے حوالی میں ہیں۔

(۱۶) سُریانیوں کے بادشاہ۔

(۱۷) بادشاہانِ موصل و نینوا جو صوری تھے۔

(۱۸) بادشاہانِ قبائل نبط وغیرہ جو کلدانی تھے۔

(۹) اوّلین سلاطین ایران۔ اُن کی سیرت۔ اُن کے حالات پر ایک مجموعی نظر۔

(۲۰) ملوک طوائف۔ یعنی شاہان اشغانی۔ جو اوّلین دور میں سلاطین فارس کے درمیان گذرے ہیں۔

(۲۱) فارسیوں کا سلسلۂ نسب۔ اقوال مذکورہ۔

(۲۲) ساسانی پادشاہ (سلاطینِ ایران کا سلسلۂ ثانیہ) بادشاہوں کی سیرت مجموعی حالات۔

(۲۳) سلاطینِ یونان کے حالات۔ اُن کے سلسلہ نسب کے بارہ میں بعض اقوال۔

(۲۴) ہندوستان میں سکندر کی جنگ (مجموعی تذکرہ)

(۲۵) شاہان یونان جو سکندر کے بعد گذرے۔

(۲۶) شاہان روم (رومان) آغاز سلسلۂ نسب۔ تعداد سلاطین۔ تاریخ سنین۔ مجموعہ سیرت۔

(۲۷) شاہان روم جو عیسائی ہوگئے۔ کہ قسطنطنیہ کے پادشاہ وہی تھے۔ اُن کے عہد کے روشن واقعات۔

(۲۸) شاہانِ روم بوقت ظہور اسلام تا بعہد ارسیذوس جو ۳۳۲ھ میں روم کا پادشاہ تھا۔

(۲۹) مصر۔ رودِ نیل۔ حالات عمارات۔ عجائب و غرائب۔ شاہانِ مصر کے واقعات۔

(۳۰) سودان۔ سلسلہ نسب۔ اختلاف اجناس و انواع۔ مقامی بنائیں۔ حالات ملوک۔

(۳۱) فرنگی۔ جلالقہ۔ اُن کے پادشاہ۔ اُن کے حالات و سیرت کا مجموعہ باشندگان اندلس کے ساتھ اُن کی لڑائیاں۔

(۳۲) نوکبرو۔ ملوک نوکبرو۔ مسالک۔ راہیں اور سڑکیں۔

(۳۳) قوم عاد۔ ملوک عاد مجموعی حالات۔ طول عمر کے متعلق اقوال۔

(۳۴) قوم ثمود۔ ملوک ثمود۔ پیغمبر ثمود حضرت صالح علیہ السلام کے مجموعی حالات۔

(۳۵) مکّہ۔ حالات مکہ۔ بنائے بیت اللہ (کعبہ شریف) قبائل جرہم وغیرہ جو یہاں آباد ہوئے۔ متفرقات باب۔

(۳۶) کرہ زمین اور اس کے شہروں اور ملکوں کا مجموعی تذکرہ۔ اشتیاق نفس بہ وطن۔

(۳۷) یمن کو یمن کیوں کہا گیا۔ شام کو شام کیوں کہا گیا۔ عراق و حجاز کو عراق و حجاز کیوں کہا گیا۔ اختلافات و مباحثات۔

(۳۸) قبائل یمن۔ ملوک یمن۔ تبابعہ وغیرہم۔ سیرت۔ مقدار سنین۔

(۳۹) حیرہ کے یمنی وغیرہ یمنی پادشاہ۔ اُن کے حالات۔

(۴۰) شام کے یمنی وغیرہ یمنی پادشاہ۔ اُن کے حالات۔

(۴۱) صحرانشین قومیں۔ اہل بادیہ و عرب وغیر عرب۔ یہ قومیں صحرانشین کیوں ہیں۔ پہاڑی کرد۔ سلسلہ نسب۔ مجموعی حالات وغیرہا۔ جو اس باب سے

ملتے جلتے واقع ہوئے ہیں۔

(۴۲) مذاہب عرب۔ معتقدات جاہلیت۔ ممالک میں متفرق ہوجانا۔ اصحاب فیل۔ حبشیوں کے حالات (وغیرہم) عبدالمطلب وغیرہ۔ ملحقات باب

(۴۳) نفس کے متعلق عربوں کے مذاہب۔ ہام۔ صفر۔ ان کے حالات

(۴۴) غولوں کے متعلق عربوں اور غیر عربوں کے اقوال۔ ملحقات باب۔

(۴۵) ہاتف غیب اور جن کے متعلق عربوں اور غیر عربوں کے اقوال جو ان کو مانتے ہیں۔ اور جو نہیں مانتے ہیں۔

(۴۶) مذاہب عرب متعلق بہ قیافہ۔ عیافہ۔ زجر۔ سانح۔ بارج وغیرہ۔

(۴۷) کہانت۔ کیفیت کہانت۔ اقوال۔ حالات۔ نفس ناطقہ وغیرہ کی حدیں۔ خواب کی باتیں وغیرہا۔ جو اسی باب سے ملتی جلتی واقع ہوئی ہیں۔

(۴۸) کاہنوں کے حالات۔ سیل عرم۔ ارض سبا۔ مارب۔ قبائل ازد کا انتشار و تفرق۔ غیر ممالک میں ان کا آباد ہونا۔ مجموعی حالات۔

(۴۹) عرب کے سنہ۔ عجم کے سنہ۔ عربی مہینے۔ عجمی مہینے متفقات مختلفات۔

(۵۰) قبطی مہینے۔ سریانی مہینے۔ سنوات۔ اختلاف اسماء تاریخ کے متعلق مجموعی بحث۔ وما یتصل بہ۔

(۵۱) سریانی مہینوں کی موافقت رومی مہینوں سے۔ تعداد ایام سنہ۔ نچھتروں کی پہچان (یا آثار کواکب)

(۵۲) ایرانی مہینے وغیرہ۔

(۵۳) ایرانیوں کا زمانہ - حالات - وغیرہا۔

(۵۴) سنین عرب - شہور عرب - روز و شب کے نام۔

(۵۵) قمری مہینوں کی راتیں - عربوں کے اقوال - وغیرہا۔

(۵۶) عالم پر آفتاب و ماہتاب کی اثر اندازی - مجموعی حالات وغیرہا۔

(۵۷) انواع عالم - اجزائے شرقی و غربی و یمنی (شمالی) و جنوبی جو تسلط کواکب کے ساتھ مختص ہیں - عجائب عالم وغیرہا۔

(۵۸) یونانیوں کے بقاع متبرکہ اور اُن کی کیفیت۔

(۵۹) صقلبیوں کے بقاع متبرکہ اور اُن کی کیفیت۔

(۶۰) قدیم رومیوں کے بقاع متبرکہ اور اُن کی کیفیت۔

(۶۱) حرّان اور غیر حران کے صابیوں کے بقاع متبرکہ اور اُن کی کیفیت - اور اُن کے عجائب و غرائب اخبار۔

(۶۲) آتش کدوں کا بیان - کیفیت - تعمیر - اخبار مجوس - ملحقات عمارت۔

(۶۳) مجموعی تاریخ عالم - از ابتدا تا بہ ولادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم - اور جو معلومات کہ اس باب سے ملتی جلتی واقع ہوئی ہیں۔

(۶۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت - نسب وغیرہ - ملحقات باب۔

(۶۵) حالات بعثت تا بہ ہجرت۔

(۶۶) مجموعی حالات ہجرت تا بہ وفات۔

(۶۷) وہ امور و حالات جو آنحضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے تا بہ وفات ظہور پذیر ہوتے رہے۔

(۶۸) وہ باتیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائیں۔ اور جو آپ سے پہلے کسی نے نہ کہی تھیں۔

(۶۹) خلافت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ۔ نسب۔ حالات۔ سیرت۔

(۷۰) خلافت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ۔ نسب۔ حالات۔ سیرت۔

(۷۱) خلافت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ۔ نسب۔ حالات۔ سیرت۔

(۷۲) خلافت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔ نسب۔ حالات۔ سیرت۔ اور آپ کے بھائیوں اور بہنوں کا سلسلہ نسب۔

(۷۳) مجموعی حالات جو صفین میں اہل عراق و اہل شام کے مابین گذرے۔

(۷۴) فیصلہ کے لئے حکم کا تقرر۔ ابتداء تحکیم۔

(۷۵) حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جنگ اہل نہروان سے جو شراۃ (خوارج) تھے وغیرہ۔

(۷۶) مقتل (شہادت) علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔

(۷۷) حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اقوال و کلمات و زہد وغیرہ۔

(۷۸) خلافت حسن بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے حالات۔ سیرت۔

(۷۹) معاویہؓ بن ابی سفیان کا زمانہ۔ حالات۔ سیرت۔ نادر واقعات۔

(۸۰) معاویہ کے مجموعی حالات۔ اخلاق۔ سیاست بعض ضروری چیزیں۔

(۸۱) صحابہ۔ مدائح صحابہ۔ علی بن ابی طالب و عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہما کے واقعات اور فضائل۔

(۸۲) مقتل (شہادت) حسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما وہ لوگ

جوآپ کے اہل بیت اور جماعت میں سے قتل (شہید) ہوئے۔

(۸۳) اسمائے اولاد علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔

(۸۴) یزید بن معاویہ کے حالات۔ سیرت۔ بعض افعال نادرہ جو حرہ وغیرہ میں پیش آئے۔

(۸۵) معاویہ بن یزید کا زمانہ۔ مروان بن حکم۔ مختار بن عبید اللہ۔ عبداللہ بن زبیر۔ بعض واقعات جو ان ایام میں پیش آئے۔

(۸۶) عبدالملک بن مروان کا زمانہ۔ حالات۔ سیرت۔ حجاج بن یوسف کے افعال و اخبار۔

(۸۷) حجاج بن یُوسف کا بیان۔ خطبات۔ بعض افعال۔

(۸۸) ولید بن عبدالملک کا زمانہ۔ حالات۔ سیرت۔ حجاج نے اس عہد میں کیا کیا کام کئے۔

(۸۹) سلیمان بن عبدالملک کا زمانہ۔ حالات۔ سیرت۔

(۹۰) عمر بن عبدالعزیز بن مروان بن حکم کی خلافت۔ حالات۔ سیرت و زہد۔

(۹۱) یزید بن عبدالملک کا زمانہ۔ حالات۔ سیرت۔

(۹۲) ہشام بن عبدالملک کا زمانہ۔ حالات۔ سیرت۔

(۹۳) ولید بن یزید بن عبدالملک کا زمانہ۔ حالات۔ سیرت۔

(۹۴) یزید بن ولید بن عبدالملک اور ابراہیم بن ولید بن عبدالملک کے زمانے کے واقعات۔

(۹۵) قبائل یمن و نزار میں تعصب پیدا ہونے کا سبب۔ اور اس کے متعصبانہ نتائج جو بنی اُمیہ کے عہد میں نمایاں ہوئے۔

(۹۶) تذکرۂ دولت عباسیہ۔ حالات مروان۔ مقتل مروان۔ اُس کی جنگ اور سیرت کے مجموعی حالات۔

(۹۷) خلافت سفاح۔ حالات سیرت۔ واقعات جو اس عہد میں پیش آئے

(۹۸) خلافت منصور۔ حالات۔ سیرت۔ واقعات جو اس عہد میں پیش آئے۔

(۹۹) خلافت مہدی۔ حالات۔ سیرت۔ واقعات جو اس عہد میں پیش آئے۔

(۱۰۰) خلافت ہادی۔ حالات۔ سیرت۔ واقعات جو اس عہد میں پیش آئے۔

(۱۰۱) خلافت ہاروں رشید۔ حالات۔ سیرت واقعات جو اس عہد میں پیش آئے۔

(۱۰۲) اخبار برامکہ اور ان کے زمانہ کے واقعات۔

(۱۰۳) خلافت امین۔ حالات۔ سیرت۔ واقعات زمانہ۔

(۱۰۴) خلافت مامون۔ حالات۔ سیرت۔ واقعات زمانہ۔

(۱۰۵) خلافت معتصم۔ حالات۔ سیرت۔ واقعات زمانہ۔

(۱۰۶) خلافت واثق۔ حالات۔ سیرت۔ واقعات زمانہ۔

(۱۰۷) خلافت متوکل۔ حالات۔ سیرت۔ واقعات زمانہ۔

(۱۰۸) خلافت منتصر۔ حالات۔ سیرت۔ واقعات زمانہ۔

(۱۰۹) خلافت مستعین۔ حالات۔ سیرت۔ واقعات زمانہ۔

(۱۱۰) خلافت معتز۔ حالات۔ سیرت۔ واقعات زمانہ۔

(۱۱۱) خلافت معتمد۔ حالات۔ سیرت۔ واقعات زمانہ۔

(۱۱۲) خلافت معتضد۔ حالات۔ سیرت۔ واقعات زمانہ۔

(۱۱۳) خلافت مکتفی۔ حالات۔ سیرت۔ واقعات زمانہ۔

(۱۱۴) خلافت مقتدر۔ حالات۔ سیرت۔ واقعات زمانہ۔

(۱۱۵) خلافت قاہر۔ حالات۔ سیرت۔ واقعات زمانہ۔

(۱۱۶) خلافت راضی۔ حالات۔ سیرت۔ واقعات زمانہ۔

(۱۱۷) خلافت متقی۔ حالات۔ سیرت۔ واقعات زمانہ۔

(۱۱۸) خلافت مستکفی۔ حالات۔ سیرت۔ واقعات زمانہ۔

(۱۱۹) خلافت مطیع۔ حالات۔ سیرت۔ واقعات زمانہ۔

(۱۲۰) ہجرت نبوی سے اب تک کے کہ ۳۳۶ھ ہیں! وراسی سال ہیں ہم اپنی اس کتاب کی تصنیف سے فارغ ہوئے ہیں۔ مجموعی تاریخ۔

(۱۲۱) ابتدائے اسلام سے ۳۳۵ھ تک کے امیرالحج۔

(۱۲۲) مجموعی ذکر القاب وبیان واعداد جواہل درایت سے مذکور ہے۔

یہ وہ مباحث جامعہ ہیں جو اس تاریخ کے ابواب میں بیان ہوئے ہیں مگر ان کے علاوہ ہر باب میں اور بھی اخبار وآثار کی ضمن میں انواع علوم و فنون مذکور ہیں جن کا عنوانات میں تذکرہ نہ ہو سکا۔ تاہم ان میں بھی وہی ترتیب

ملحوظ ہے جبکی تفصیل خلفا کی تاریخ اور اُن کی عمروں کی مقدار میں ہم پہلے کر چکے ہیں۔ کہ اُن کی حیات وحالات کے جُدا جُدا فصول ہیں۔ پھر اُن کے روشن و افخات ہیں۔ اصلی حقائق سیرت و سریرت ہیں مجموعی حالات زمانہ ہیں۔ احوال وزرائے دولت ہیں انواع علوم کے متعلق اُن کی مجلسوں کے ماجرے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک کے فحوائے فن و معنی کے لیئے ہم اپنی سابق تصنیفات و تالیفات کے اشارے بھی کرتے گئے ہیں۔ ابواب کتاب کا شمار ۱۳۲ ہے جس میں پہلا باب تذکرہ اغراض کتاب۔ دُوسرا محتویات و مشتملات اور آخری باب ۳۳۵ھ تک کے امرائے حج اور اُن کے القاب کے بیان میں ہے :۔

متروکات

علامہ مسعودی نے ابتدائے آفرینش سے سلسلہ تاریخ کو شروع کیا ہے لیکن اس باب کو بالفعل ہم موخر کیئے دیتے ہیں۔ اور حضرت نوح علیہ السلام کے واقعات سے ترجمہ کتاب کی ابتدا کرتے ہیں جو لمک (لامک) بن متوشلخ بن ادریس (اخنوخ) کے فرزند تھے۔ کہا جاتا ہے کہ بلغاری و روسی و صقلبی یعنی سلافی یا سلاؤ نسل کی قومیں حضرت ادریس علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ وقت بھی آئیگا کہ جس باب کا ترجمہ رہ گیا ہے وہ بھی شائع کر دیا جائیگا لیکن سر دست حضرت نوح علیہ السلام کے واقعات سے ابتدا کی جاتی ہے۔ (وباللہ التوفیق)

حضرت نوح علیہ السلام

فراوانی فتنہ وفساد نے جب روئے زمین پر شدید ترین تاریکی پھیلائی تو

حضرت نوحؑ دعوت الی اللہ کے لیئے اُٹھے۔ مگر قوم نے اس دعوتِ حق کو لبیک کہنے سے انکار کر دیا۔ اور سرکشی و کفر سے کوئی باز نہ آیا۔ ناچار حضرت نوح علیہ السلام نے خدا کی جناب میں رجوع کیا اور قوم کو بددعا دی۔ خدا نے کشتی بنانے کے لئے وحی بھیجی جس سے فارغ ہونے پر حضرت جبریل آئے۔ اور حضرت آدمؑ کا تابوت ساتھ لائے۔ جمعہ ۱۹۔ آذر ماہ کو نوحؑ اپنی جماعت کے ساتھ کشتی میں اسوار ہوئے۔ جو پانی پر رواں تھی۔ اور پانچ مہینے کی مدت میں ساری زمین غرق ہو گئی۔ آخر اللہ تعالٰے نے زمین کو جذبِ آب اور آسمان کو امساکِ باراں کا حکم دیا۔ کشتی کوہ جودی پر آکے ٹھہر گئی۔ یہ پہاڑی جزیرہ ابنِ عمر موصلی کے علاقۂ ماسور میں واقع ہے۔ اور اس کے اور دریائے دجلہ کے درمیان آٹھ فرسنگ کی مسافت واقع ہے۔ کشتی کے خروج کی جگہ اس پہاڑی کی چوٹی پر اب تک واضح ہے ؛

یہودیوں کی ایک کہانی

یہ بھی بیان کیا گیا ہے۔ کہ خدا نے جب زمین کو پانی جذب کر لینے کا حکم دیا۔ تو بعض اقطاعِ ارض نے امتثالِ امر میں جلدی کی۔ اور بعض نے جلدی نہ کی۔ جن اقطاع نے فرمانِ الٰہی کی فے الفور اطاعت کی۔ کھودنے سے اُن کا پانی شیریں نکلتا ہے۔ جن حصوں نے دیر کی اُنہیں آبِ شور۔ شورہ اور ریت سے بہرہ ملا اور جس پانی کو زمین جذب نہ کر سکی۔ وہ بہ اختلاف موقع و مقام قعروں اور

گڑھوں میں گر کے جمع ہو گیا۔ اور اُسی کے سمندر ہو گئے۔ یہ وہی مغضوب پانی ہے جس سے خدا نے کتنی قومیں ہلاک کیں۔

اولادِ نوحؑ کشتی سے حضرت نوح اپنے تینوں بیٹوں سام۔ حام۔ یافث کو لے کر اُترے۔ جن کے ساتھ اُن کی بیویاں بھی تھیں۔ تمام نفوس کی تعداد اسّی تھی۔ چالیس مرد اور چالیس عورتیں سب نے مِل کے اسی پہاڑ کے دامن میں ایک شہر آباد کیا۔ جس کا نام "ثمانین" رکھا (عربی و عبری و سُریانی وارامی زبانوں میں ثمانین اسّی (۸۰) کو کہتے ہیں) اس شہر کا یہی نام اب بھی ہے۔ اور آج تک یہ اسی نام سے موسوم ہے۔

ان اُسّی نفوس میں سے نسلِ انسانی صرف حضرت نوح کے تینوں بیٹوں سے چلی۔ اللہ تعالےٰ نے بھی یہی خبر دی ہے کہ وجعلنا ذریتہ ھم الباقین یعنی صرف ذریّتِ نوحؑ کو ہم نے باقی رکھا۔ اس تاویل کی حقیقت خدا ہی خوب جانتا ہے۔

نوح علیہ السلام کا وہ لڑکا جو کشتی میں سوار نہیں ہوا تھا۔ اور جس کے لئے حضرت نوحؑ نے کہا تھا۔ کہ یا بنی ارکب معنا (اے میرے بیٹے میرے ساتھ سوار ہو جا) اُس کا نام "حام" تھا۔

نوحؑ نے اپنے فرزندوں میں زمین تقسیم کر دی۔ اور ہر ایک کو ایک ایک حصّہ دے دیا۔ حام سے حضرت نوح کسی بات سے ناراض تھے اور ساتھ ہی اس بات کی شہرت بھی ہے۔ اس کو بد دعا دی کہ حام ملعون ہے اپنے بھائیوں کا سرکش غلام رہیگا۔ سام بابرکت ہوگا۔ اور خدا یافث کو بڑھائیگا۔

اور سام کی آبادی میں بھی یافث آجائیگا۔

توراۃ میں ہے کہ طوفان کے بعد حضرت نوحؑ تین سو پچاس برس زندہ رہے لہذا اُن کی تمامتر عمر نوسو پچاس برس کی ہوگی۔

حام چلا گیا۔ اور اُس کی اولاد بھی اُسی کے ساتھ چلی گئی۔ ان سب نے برو بحر میں اپنی بستیاں بسائیں۔ جن کا تذکرہ ہم کسی دُوسری جگہ کرینگے۔ اور یہ بھی بتائیں گے کہ نسلِ آدم کیونکر پھیلی۔ اور یافث و سام و حام کی اولاد نے کہاں کہاں آبادیاں قائم کیں۔

سام بن نوحؑ کی نسل

سام نے ناف زمین میں کہ حرم بیت اللہ کا علاقہ ہے۔ بُود و باش اختیار کی جس کی حدیں تا بہ حضر موت۔ تا بہ عمان۔ تا بہ عالج وسیع تھیں۔

سام کے لڑکے ارم و ارفخشذ تھے۔

ارم کی اولاد میں ایک تو قبائل عاد بن عوص بن ارم بن سام بن نوح ہیں جن کا علاقہ احقاف رمل (عرب) تھا۔ اور حضرت ہود علیہ السلام اُن میں پیغمبر بھیجے گئے تھے۔

دوم:۔ ثمود بن عاثر بن ارم جو علاقہ حجر (عرب) میں فروکش تھے۔ کہ حجاز و شام کے مابین واقع ہے۔ خدا نے اُن میں اُن کے بھائی حضرت صالحؑ کو پیغمبر بنا کر بھیجا تھا۔ جنہیں وہ واقعات پیش آئے کہ واضح و مشہور ہیں۔

سوم۔ طسم۔ و جدیس۔ فرزندان لاوذ بن ارم۔ جو یمامہ و بحرین (عرب) میں فروکش ہُوئے۔ اور کچھ شام میں جا رہے۔ قوم عمالقہ کہ مختلف ممالک میں

پھیل گئی تھی۔ اسی نسل میں سے تھی۔

امیر بن لاؤذ بن ارم بھی انہیں کے بھائی تھے جو فارس (ایران) میں فروکش ہوئے۔ یہ بھی کہا گیا ہے۔ کہ قبیلہ امیم سرزمین "دبار" میں فروکش ہوا تھا۔ اور یہ وُہی علاقہ ہے۔ کہ راویان اخبار عرب گمان کرتے ہیں۔ کہ اس پر جن غالب آگئے تھے۔

فرزندان عمیل بن عوض برادر عاد بن عوض رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کے شہر (مدینہ) میں فروکش ہوئے۔ اور ماس بن سام بن نوح نے بابل میں قیام کیا اس کا لڑکا نمرود تھا جس نے بابل میں صرح (منارہ یا لاٹ) بنایا دریائے فرات کے ساحل پر پُل بندھوایا۔ اور پانسو برس تک بادشاہی کرتا رہا۔ وہ قوم قبط کا بادشاہ تھا۔ اور اُسی کے زمانہ میں خدا کی قدرت نے زبانوں میں (بزعم یہود) فرق ڈال دیا۔ اولاد سام میں ۱۹ زبانیں رائج ہوئیں۔ اولاد حام میں ۱۷ اور اولاد یافث میں ۳۶۔ اس کے بعد اور بھی زبانیں شاخ در شاخ نکلتی رہیں۔ آخر نسل انسانی ملکوں میں پھیل گئی۔ اس حالت میں لوگوں نے عراق میں جو اشعار کہے اُن کا تذکرہ بھی آئیگا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اقوام میں جس نے زمین کی تقسیم کی، وہ فالغ تھا۔ جس کے معنے فالح یعنی قاسم کے ہیں (فلغ۔ فلح اور قسم۔ سب کے معنے تقسیم ہی کے ہیں) یہ قاسم الارض (فالغ) شالح کے لڑکے تھے۔ اور وہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جد (دادا) ہیں۔ شالح بن فالغ کے لڑکے عابر تھے اُن کے قحطان اُن کے یعرب۔ یعرب ہی کو اوّل اوّل اُن کی اولاد نے پادشاہی سلام

(انعم صباحا اور بیت اللعن) کیا۔ لیکن ایک ضعیف روایت یہ بھی ہے کہ حیرہ کے ایک پادشاہ کو پہلے پہل سلام کیا گیا تھا۔ تمام قبائل یمن کے مورث قحطان ہی تھے۔

عربیّت کی ابتدا یعرب نہایت فصیح اللسان تھا۔ اپنے معنی و مفہوم کو اچھی طرح واضح کر دیا کرتا تھا۔ اور اسی بناء پر وہ پہلا شخص تھا۔ جس نے عربی زبان میں گفتگو کی (کیونکہ عربیت کے معنے بھی ابضاع وافصاح ہی کے ہیں)

یقطن بن عابر بن شالخ کو جرہم بھی کہتے ہیں۔ جو یعرب کے بنی عم تھے۔ یہ خاندان اُن قبائل میں سے تھے۔ جو پہلے یمن میں آباد تھے۔ اور ان کی بول چال عربی ہوگئی تھی۔ بعد میں وہ لوگ مکہ مبارکہ میں آباد ہوئے۔ جیسا کہ ہم ان کے حالات میں بیان کرینگے۔ قبیلۂ بنی قطورا نہیں کے بنی عم ہیں۔ آخر اللہ تعالٰے نے مکہ مبارکہ کو حضرت اسماعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مسکن قرار دیا۔ وہیں آپ نے بُود و باش اختیار کرلی۔ اور قبیلۂ جرہم ہی میں آپنے نکاح بھی کیا۔ لہٰذا بنی اسماعیلؑ کے ماموں یہ لوگ ہوئے۔

خرافات یہود اہلِ کتاب (یعنی بنی اسرائیل) کا بیان ہے۔ کہ سام بن نوح علیہ السلام کے بیٹے مالک بن سام اب تک زندہ ہیں۔ اور ہمیشہ (تا قیامت) زندہ رہیں گے۔ اسلیئے کہ اللہ تعالےٰ نے سام بن نوح علیہ السلام کو وحی بھیجی تھی۔ کہ حضرت آدم علیہ السلام کے جثہ کی حفاظت جس کو تم نے سپرد کی تھی۔ میں نے اُسے بقائے ابد و حیات جاوید کی نعمت عطا فرمائی۔ بات یہ ہے کہ سام بن نوح علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام کا

تابوت ناف زمین میں دفن کیا تھا۔ اور مالک کو اُن کی قبر کی حفاظت پر مامور وموکل بنایا تھا۔

ساميوں کا سلسلہ سام بن نوح علیہ السّلام کے بعد بنی سام کی سرگروہی ارفخشد بن سام کو حاصل ہوئی۔ جن کی عُمر قبض رُوح کے وقت چار سو ۶۵ برس کی تھی۔ وہ ماہ نیستان میں واصل بحق ہوئے۔

ارفخشد کے بعد شالح بن ارفخشد سرگروہ ہوئے۔ جن کی عمر قبض رُوح کے وقت ۴۳۰ برس کی تھی۔

عابر کے بعد فالغ بن عابر سرگروہ ہوئے۔ آباؤ اجداد کے حسب معمول ان کی سرگروہی بھی اُسی نہج پر رہی۔ قبض رُوح کے وقت ان کی عمر دوسو برس کی تھی۔ اس تاریخ میں ان کا تذکرہ پہلے بھی آچکا ہے۔

فالغ کے بعد رعو بن فالغ سرگروہ ہوئے۔ ایک ضعیف روایت ہے کہ جبار بابل (نمرود) انہیں کے زمانہ میں پیدا ہوا تھا۔ جب ان کا انتقال ہوا ہے تو اس وقت ان کی عمر دو سو برس کی تھی۔ نیستان کے مہینے میں ان کی وفات واقع ہوئی۔

رعو کے بعد ساروغ بن رعو سرگروہ ہوئے۔ ایک ضعیف روایت ہے کہ انہیں کے زمانہ میں بُت پرستی وصورتگری نکلی جس کے مختلف اسباب تھے۔ کہ روئے زمین پر اس کے متعدد موجبات پیدا ہو گئے تھے۔ جب اُن کی وفات ہوئی ہے تو ان کی عمر دوسو تئیس برس کی تھی۔

ساروغ کے بعد ناحور بن ساروغ سرگروہ ہوئے۔ اور اپنے آبا و اجداد کے طریقہ پر چلے۔ اُن کے زمانہ میں ایسے ایسے زلزلے آئے کہ پہلے کبھی نہ آئے تھے۔

ناحور کا زمانہ ساروغ کے بعد تھا۔ انہیں ایام میں بہت سی مصیبتیں اور آفتیں بھی حادث ہوئیں۔ اور نئے نئے آلات بنائے گئے ہندوستانیوں اور ایسے ہی دوسری قوموں کے الگ الگ جتھے بن گئے۔ وفات کے بعد ان کی عمر ایک سو چھیالیس برس کی تھی۔

ناحور کے بعد اُن کے لڑکے تارح کی نوبت آئی۔ کہ یہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ آذر تھا۔ اور اسی کا زمانہ نمرود بن کنعان کا زمانہ تھا۔

نمرود آتش پرستی اور روشنی کے پوجنے کا رواج نمرود ہی کے زمانہ میں ہوا۔ جس نے نار و نور کی عبادت و پرستش کے متعدد مراتب مدارج قائم کئے تھے۔ حرب و ضرب و حادثات جنگ و جدال اور مشرق و مغرب وغیرہ میں نئی نئی مملکتیں قائم ہو جانے کے باعث یہ زمانہ روئے زمین پر بڑے اضطراب کا زمانہ تھا۔ اس زمانہ میں علم ہیئات کو ترقی ہوئی۔ ستاروں کے احکام کی بات نکلی۔ افلاک کی رصد باندھی گئی۔ اور اُن کی تصویریں بنائی گئیں۔ علم ہیئات کے آلات وضع ہوئے۔ اور لوگوں کے لئے یہ تعلیم قریب الفہم بنا دی گئی۔

نجومیوں نے ہر سال کے احکام لگائے تھے۔ جس سال حضرت ابراہیم علیہ السلام پیدا ہوئے ہیں۔ اُس کے زائچہ طالع کا حساب لگا کر نمرود کو اطلاع دی تھی۔ کہ فلاں سال میں ایک لڑکا پیدا ہوگا۔ جو اُن کی عقل و

دانش کو مبنی بر سفاہت بتائیگا۔ اور کواکب پرستی کو مٹا دیگا۔ جب وہ سال آیا تو نمرود نے بچوں کے پیدا ہوتے ہی قتل کردینے کا حکم نافذ کر دیا۔ مگر حضرت ابراہیمؑ چھپا دیئے گئے تھے۔

آذر کہ وہی تارح تھا جب مرا ہے تو اس کی عمر دو سو ساٹھ برس کی تھی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام } جب حضرت ابراہیم علیہ السلام بڑھے اور اُس غار سے نکلے (جس میں ابتدائی پرورش کے لئے بخوف نمرود وہ چھپا دیئے گئے تھے) تو سب سے پہلے اُن کی نظر زمین پر پڑی۔ کائنات کو دیکھا۔ عالم و مافی العالم میں نظر کی۔ دلائل حدوث دیکھے۔ تاثیرات کا مطالعہ کیا۔ سیارہ زہرہ اور اُس کی روشنی دکھائی دی۔ تو اُسی کو پروردگار کہنے لگے۔ چاند میں اُس سے زیادہ روشنی دیکھی تو اُسی کو معبود مان لیا۔ آفتاب کو جب سب سے روشن تر پایا۔ تو فرمایا کہ یہ بڑا ہے۔ یہی میرا پروردگار ہے۔

سیاروں کو پروردگار کہنے کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ بات بطریق استدلال و استخبار کہی تھی۔ بعض کی رائے ہے۔ کہ یہ ایام بلوغ سے پہلے مگر سن تکلیف کے وقت کا واقعہ ہے۔ بعض کی رائے کچھ اور ہے۔ بہرحال اس واقعہ کے بعد حضرت جبریلؑ اُن پر نازل ہوئے۔ دین کی تعلیم اُنہیں دی۔ خدا کے برگزیدہ ہوئے۔ اور نبی اللہ کے ساتھ خلیل اللہ کے رتبہ پر بھی فائز ہوئے۔ اُن میں رشد کا مادہ پہلے

ہی سے تھا۔ اور جو صاحب رشد ہوتا ہے وہ خطا و لغزش و عبادت غیر اللہ سے محفوظ رہتا ہے۔ اسی بنا پر جب حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کو غیر اللہ کی عبادت کرتے دیکھا۔ کہ مجوّفات و مجسّمات کو اپنا دیوتا بنا لیا ہے۔ تو ان کی عیب گیری فرمانے لگے۔ تا آنکہ نمرود نے اُنہیں آگ میں ڈلوا دیا۔ مگر خدا نے اس آگ کو گلزار کر دیا (یہودیوں کی ایک روایت اس باب میں ہے کہ) حضرت ابراہیمؑ پر جب آتشِ نمرود گلزار ہوئی ہے۔ تو اُس دن تمام روئے زمین کی آگ بُجھ گئی تھی۔

حضرت ابراہیمؑ کی عمر جب چھیاسی یا ستاسی برس کی ہو گئی تو حضرت اسماعیلؑ پیدا ہوئے۔ ایک ضعیف روایت یہ بھی ہے۔ کہ حضرت اسماعیلؑ کی پیدائش کے وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر ستّر برس کی تھی۔ حضرت اسماعیلؑ کی ماں ہاجرہ حضرت سارہ کی لونڈی تھیں۔ جو لوگ مومنین اوّلین میں شمار ہوئے ہیں اور سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السّلام پر ایمان لائے ہیں۔ ان سب میں حضرت سارہ کو تقدم حاصل ہے۔ سارہ حضرت ابراہیمؑ کے چچا بتوایل بن ناحور کی لڑکی تھیں (اور اس لئے ابتدائی رشتہ میں حضرت ابراہیمؑ کی عم زاد بہن ہوتی تھیں)۔ اس کے علاوہ بطریق ضعیف دوسری روایتیں بھی مروی ہیں۔ جن کا تذکرہ ہم کسی دوسری جگہ کریں گے۔

حضرت لوطؑ } حضرت لوط بن ہاران بن تارح بن ناحور بھی حضرت ابراہیمؑ پر ایمان لا چکے ہیں۔ یہ حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے تھے۔

خدا نے انہیں ارض سدوم اور اس کے پانچوں علاقوں میں پیغمبر بنا کے بھیجا

تھا۔ سدوم کی یہ پانچوں بستیاں حسب ذیل تھیں:۔

(۱) صبغہ (۲) غمرہ (۳) ادماؤ (۴) صبوغ (۵) بالع۔

جو لوگ اصحاب الموتفکہ کے نام سے مشہور ہیں۔ وہ بھی قوم لوط کے لوگ تھے۔ لفظ موتفکہ مادہ ''اَفک'' سے مشتق ہے جس کے معنے کذب و ناراستی و دروغ کے ہیں۔ یہ ان اہل الرائے کا بیان ہے۔ جو ان اسمائے قدیمہ کے اشتقاق کے قائل ہیں۔ اور بطریق عربیت اشتقاق کے قائل ہیں۔

اللہ تعالےٰ نے بھی اصحاف الموتفکہ کا تذکرہ کیا ہے۔ قرآن میں ''والموتفکہ'' اہوے کی آیت موجود ہے۔

ارض سدوم یا دیار موتفکہ وہ علاقہ ہے۔ جو حدود شام و حجاز کے مابین ارض اردن و بلاد فلسطین کے متصل واقع ہے۔ اتنی بات ہے کہ فلسطین تو شام میں ہے۔ اور یہ شام میں داخل نہیں۔ اس وقت تک کہ ۱۳۳۲ھ کا زمانہ ہے۔ یہ علاقہ ویران چلا آتا ہے۔ اس میں کوئی بھی آباد نہیں۔ اُلٹے پتھر اس میں موجود ہیں۔ جو مسافروں اور سیاحوں کو سیاہ نظر آتے ہیں۔

حضرت لوط علیہ السلام اس علاقہ میں بیس برس سے چند سال اوپر تک مقیم رہے۔ اور لوگوں کو خدا کی جانب بلاتے رہے۔ ایمان باللہ کی دعوت دیتے رہے۔ مگر یہ لوگ ایمان نہ لائے۔ آخر عذاب میں مبتلا ہوئے جیسا کہ خود اللہ تعالےٰ نے ان کے متعلق خبر دی ہے۔

وادی غیر ذی زرع } حضرت اسماعیلؑ جب پیدا ہوئے تو حضرت ابراہیم ان کو لے کر مکہ مبارکہ پہنچے۔ اور وہیں

ان کی بود و باش کی راہ نکالی۔ اللہ تعالٰے نے بھی حضرت ابراہیمؑ کی زبان سے حضرت اسمٰعیلؑ کے متعلق اسی طرح خبر دی ہے۔ جس میں خدا سے وہ دعا کرتے ہیں کہ ربّ انی اسکنتُ من ذریتی بوادٍ غیر ذی زرعٍ عند بیتك المحرم (اے میرے پروردگار میں نے اپنی نسل میں سے بعض کو تیری حرمت و عظمت والے گھر کے قریب ایک بنجر وادی میں ٹھہرایا ہے) اللہ تعالٰے نے حضرت ابراہیم کی دعا قبول کر لی۔ کہ ان ذرّیات ابراہیم کی تنہائی و وحشت رفع کر دی۔ قوم جرہم و عمالقہ سے اُن کو مانوس ہونے کا موقع دیا۔ اور بہتیرے انسانوں کے قلوب ان کی جانب مائل کر دیئے۔

قوم لوطؑ کو اللہ تعالٰی نے حضرت ابراہیمؑ ہی کے زمانہ میں اُن کی کرتوتوں کے باعث ہلاک کیا تھا۔

ذبح عظیم اللہ تعالٰے نے حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ اپنے فرزند کی قربانی کریں۔ امتثالِ امر و اطاعتِ حکم میں انہوں نے فی الفور مبادرت کی۔ اور لڑکے کی قربانی کرنے پر تیار ہو گئے۔ قرآن میں اس کے لئے وتلّه للجبین کے الفاظ وارد ہیں۔ آخر اللہ تعالٰے نے انہیں بچا لیا۔ اور ان کے بدلہ ایک جانور کی قربانی ہوئی۔ فدیناہ بذبحٍ عظیم میں اسی واقعہ کا تذکرہ ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کے پہلے لڑکے تو حضرت اسمٰعیلؑ تھے۔ ان کے بعد حضرت سارہ کے بطن سے حضرت اسحاقؑ پیدا ہوئے۔ اور اُس وقت پیدا ہوئے جب حضرت ابراہیمؑ کی عمر ایک سو بیس برس کی ہو چکی تھی۔

قربانی کہاں ہوئی } اس امر میں اختلاف ہے کہ ذبیح کون تھا۔ یعنی قربانی کے لئے حضرت اسماعیلؑ کے واسطے حکم ہؤا تھا۔ یا حضرت اسحاق علیہ السلام کے لئے۔ بعض تو حضرت اسماعیل کے حق میں ہیں! ور بعض اس سے حضرت اسحاقؑ کو مراد لیتے ہیں۔ اگر ارض حجاز میں یہ واقعہ پیش آیا ہے۔ تو حضرت اسماعیلؑ ہی ذبیح رہے ہوں گے۔ لیکن شام میں اگر یہ صورت ہوئی ہے۔ تو پھر حضرت اسحاقؑ ذبیح مانے جائینگے۔ اس لئے کہ حضرت اسماعیل جس دن سے شام سے حجاز میں لائے گئے۔ پھر کبھی شام کو واپس نہ گئے۔ اور نہ اس ملک میں داخل ہوئے۔

حضرت ابراہیمؑ کا دوسرا نکاح } حضرت سارہ کی وفات کے بعد حضرت ابراہیمؑ حضرت قنطوراؑ کو اپنے حبالۂ عقد میں لائے۔ جن سے چھ لڑکے پیدا ہوئے۔

(۱) مرق (۲) نفس

(۳) مدن (۴) مداین

(۵) سنان (۶) سرح

حضرت ابراہیمؑ کی وفات } حضرت ابراہیمؑ نے ارض شام میں انتقال کیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ایک سو پچانوے برس کی تھی۔ اللہ تعالٰے نے ان پر دس صحیفے نازل کئے تھے۔

حضرت اسحاقؑ } حضرت اسحاقؑ نے حضرت ابراہیمؑ کے بعد بتوایل کی لڑکی ومحاء سے نکاح کیا جن سے ایک ہی مرتبہ دو

لڑکے حضرت عیصؑ و حضرت یعقوبؑ پیدا ہوئے۔ حضرت عیص بڑے معلوم ہوتے تھے۔ اور حضرت یعقوبؑ چھوٹے۔ ان کی پیدائش کے وقت حضرت اسحاقؑ کی عمر ساٹھ برس کی تھی۔ ان کی بصارت جاتی رہی۔ حضرت یعقوبؑ کے لئے دُعا کی کہ وہ اپنے بھائیوں پر سردار ہوں۔ اور ان کی اولاد میں نبوت کا سلسلہ جاری رہے اور عیص علیہ السلام کو دعا دی کہ ان کی اولاد میں بادشاہی رہے۔

حضرت اسحاقؑ کی جب وفات ہوئی ہے تو اس وقت اُن کی عمر ایک سو پچاس برس کی تھی۔ وہ اپنے والد حضرت ابراہیمؑ کے قریب دفن کئے گئے۔ ان کی قبریں مشہور ہیں۔ جو بیت المقدس سے اٹھارہ میل کی مسافت پر ایک مسجد کے اندر واقع ہیں۔ اس مقام کا نام "مسجد و مرعی ابراہیم" ہے۔ یعنی حضرت ابراہیمؑ کی مسجد اور ان کی چراگاہ۔

حضرت یعقوبؑ حضرت اسحاقؑ نے حضرت یعقوبؑ کو حکم دیا تھا کہ شام میں چلے جائیں۔ اُن کو اور اُن کے بارہوں بیٹوں کو پیغمبری کی بشارت بھی دی تھی۔ جن کے نام حسب ذیل ہیں:-

(۱) لادی	(۲) یہودہ
(۳) یساخر	(۴) زبولون
(۵) یوسف	(۶) بنیامین
(۷) روان	(۸) نفتالی
(۹) کان	(۱۰) اشار
(۱۱) شمعون	(۱۲) روبیلؑ

انہیں لوگوں کو "اسباط اسرائیل" یا صرف "اسباط" ہی کہتے ہیں۔ ان میں سے جن کی اولاد میں نبوت و حکومت کا سلسلہ جاری رہا وہ چار تھے (۱) لاوی (۲) یہودہ (۳) یوسف (۴) بنیامین۔ حضرت یعقوب اپنے بھائی عیص سے نہایت خوفزدہ تھے۔ جن سے خدا نے اُن کو محفوظ رکھا۔

حضرت یعقوبؑ کے ساڑھے پانچ ہزار بھیڑ بکریاں تھیں جن میں سے عیص کو انہوں نے دسواں حصہ دے دیا تھا۔ کہ اُن کے شر سے بچے رہیں۔ اور اُن کی سطوت کا خوف جاتا رہے۔ یہ بھیڑ بکریاں حضرت یعقوبؑ نے خوف زدہ ہو کر عیص کو اس وقت دی تھیں جب خدا نے ان کو محفوظ و مامون رکھنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ کہ یعقوب کو ایذا دینے کی سبیل عیص کو حاصل نہ ہوگی۔ اس وعدہ الٰہی کے ہوتے ہوئے بھی دفع فتنہ کے لئے جب یعقوب نے عیص کے تطاول و تعدی سے بچنے کی تدبیر کی۔ تو خدا نے وعدہ خداوندی کی خلاف ورزی کرنے اور اس پر مطمئن نہ ہونے کی بنا پر اس کی سزا یعقوبؑ کو اُن کی اولاد کے بارہ میں دی۔ اور وحی بھیجی کہ "میری بات پر کیا تجھے اطمینان نہ ہوا؟ اچھا اب میں تیری اولاد پر عیص کی اولاد کو ساڑھے پانچ سو برس تک فرمانبردار رکھونگا۔" یہ وہی زمانہ تھا۔ جب کہ رومیوں نے بیت المقدس کو خراب و خستہ اور ویران کر ڈالا تھا۔ اور بنی اسرائیل کو غلام بنا لیا تھا۔ یہ حالت اُس زمانہ تک قائم رہی کہ حضرت عمرؓ نے بیت المقدس کو فتح کیا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام } حضرت یعقوبؑ کے محبوب ترین فرزند حضرت یوسفؑ تھے۔ بھائیوں نے حسد کیا۔ اور حضرت یوسفؑ

کے ساتھ اُن کو وُہ واقعات پیش آئے جن کا قصہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے۔ اپنے پیغمبر (صلے اللہ علیہ وسلم) کی زبان سے ان امور کی اطلاع دی ہے۔ اور اُمت نبویہ میں یہ خبر مشہور ہو چکی ہے۔

ایک سو چالیس برس کی عمر میں حضرت یعقوب علیہ السلام نے ملک مصر میں وفات پائی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اُن کا جنازہ اُٹھایا اور تابوت کو علاقہ فلسطین میں دفن کیا۔ جہاں حضرت ابراہیم و حضرت اسحاق علیہما السلام کی تربتیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کی رُوح جب قبض کی ہے۔ تو اُس وقت اُن کی عمر ایک سو بیس برس کی تھی۔ اُن کا تابوت سنگِ رخام کا بنایا گیا۔ درزیں جست سے جوڑی گئیں۔ اور ایسا روغن لگایا گیا۔ کہ تابوت کے اندر پانی اور ہوا کا اثر تک پہنچنے نہ پائے۔ تجہیز کے بعد اس تابوت کو رودِ نیل میں اُس موقع پر ڈال دیا گیا۔ جس کے متصل شہر منف آباد ہے۔ حضرت یوسفؑ کی مسجد بھی یہیں واقع ہے۔ ایک ضعیف روایت یہ بھی ہے کہ حضرت یوسفؑ نے وصیت کی تھی۔ کہ اُن کے تابوت کو اُٹھا کر مصر سے فلسطین لے جائیں اور حضرت یعقوبؑ کی قبر کے پاس حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مسجد میں دفن کریں۔

حضرت ایوبؑ

حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ ہی میں حضرت ایوب علیہ السلام بھی تھے۔ جن کا سلسلہ نسب اس طرح ہے :۔

ایوب بن موص بن رزاح بن رعوایل بن عیص بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام

حضرت ایوبؑ ملک شام کی سرزمین حوران وتنیہ میں تھے۔ جو دمشق وجابیہ کا علاقہ ہے۔ وہ بڑے دولتمند وصاحب اولاد تھے۔ اللہ تعالٰے نے اُنہی کو ابتلا میں ڈالا۔ اور یہ ابتلا خود اُن کی ذات۔ اُن کے مال۔ اور اُن کی اولاد کے متعلق تھا۔ اُنہوں نے ان سب پر صبر کیا اور اس کی جزا میں اللہ تعالٰے نے جو کچھ اُن سے لیا تھا۔ سب اُنہیں واپس دیدیا۔ اور اُن کی لغزش بھی معاف کردی۔ جس کا نتیجہ یہ ابتلا تھا۔ اللہ تعالٰے نے یہ واقعات اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اپنی کتاب میں بیان کردیئے ہیں۔ حضرت ایوبؑ کی مسجد جس میں وہ خدا کی عبادت کرتے تھے۔ اور چشمہ جس میں اُنہوں نے غسل کیا تھا آج کے دن تک کہ ۳۳۲ھ ہے موجود ومشہور ہیں۔ یہ علاقہ نوی وجولان میں واقع ہیں۔ جو دمشق وطبریہ کے درمیان ہے۔ اور اقطاع اردن میں شمار ہوتا ہے۔ اور یہ مسجد وچشمہ شہر نوی سے تقریباً تین میل کی مسافت پر ہے۔ وہ پتھر بھی ہے جہاں حضرت ایوبؑ نے ایام ابتلا میں پناہ لی تھی۔ اور وہ اور اُن کی بیوی جن کا نام "رحمہ" تھا وہیں پناہ گیر تھیں۔ مسجد ایوبؑ میں وہ پتھر اب تک موجود ہے۔

موسٰیؑ جو مشہور پیغمبر نہ تھے } علما نے تورات ومتبحرین صحائف انبیاء وکتب قدیمہ بیان کرتے ہیں کہ مشہور پیغمبر حضرت موسٰےؑ بن عمران سے پہلے ایک اور موسٰیؑ بھی گذرے ہیں۔ جو میشا بن یوسفؑ بن یعقوبؑ کے بیٹے تھے۔ یعنی حضرت یوسفؑ کے پوتے اور حضرت یعقوبؑ کے پڑپوتے یہی موسٰےؑ ہیں۔ جو حضرت خضرؑ کی تلاش میں پھرے۔ اور اُن کی طلب

میں رہے۔

حضرت خضرؑ } حضرت خضر علیہ السلام کا سلسلہ نسب یہ ہے:۔
خضر بن لمکان بن خالغ بن عابور بن شالح بن ارفخشد
بن سام بن نوح علیہ السلام۔

لیکن بعض اہل کتاب ان کا نسب نامہ اس طرح بیان کرتے ہیں:۔
خضر بن عمیائیل بن نصر بن عیص بن اسحاق بن ابراہیم علیہما السلام۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ خضر کا نام "خضرون" تھا۔ خدا نے اُن کو اُن کی قوم میں پیغمبر بنا کر بھیجا تھا۔ اور قوم نے خضر کی دعوت قبول بھی کر لی تھی۔ اور خدا پہ ایمان بھی لے آئے تھے۔

حضرت موسےٰؑ جو مشہور پیغمبر تھے } حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سلسلہ نسب اس طور پر ہے:۔

موسیٰ بن عمران بن قاہت بن لاوی بن یعقوب علیہ السلام۔

مصر میں حضرت موسیٰ اُس فرعون کے زمانہ میں تھے جو بڑا ظالم اور بہت بڑا جبار تھا۔ اور جس کا نام ولید تھا۔ فرعون کا سلسلہ نسب یہ ہے:۔

ولید (فرعون) بن مصعب بن معاویہ بن ابونمیر بن ہلواس بن لیث بن ہران بن عمر بن عملاق۔

فراعنۂ مصر کے سلسلہ میں وہ چوتھا فرعون تھا۔ اُس کا رشتہ عمر بہت دراز تھا۔ اور جسم بھی بہت تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بعد سے بنی اسرائیل غلام بنا لئے گئے تھے۔ اور اُن پر شدید ابتلاء نازل ہوئے کاہنوں اور نجومیوں

اور جادوگروں نے فرعون کو اطلاع دی تھی۔ کہ عنقریب ایک لڑکا پیدا ہوگا۔ جس سے اُس کے ملک پر زوال آئیگا۔ اور مصر میں اُس کے باعث امورِ عظیمہ حادث ہونگے۔ فرعون نے اس خبر سے خوفزدہ ہوکر بچوں کے ذبح کرنیکا حکم دے رکھا تھا۔ حضرت موسیٰ کا یہ معاملہ پیش آیا۔ کہ اللہ تعالےٰ نے اُن کی ماں کو وحی بھیجی۔ کہ اس بچہ کو دریا میں ڈال دو۔ یہی ہوا اور وُہ دریا میں ڈال دیئے گئے۔ تا آنکہ وہ تمام واقعات اوّل سے آخر تک پیش آتے رہے۔ جن کی خود اللہ تعالےٰ نے خبر دی ہے اور اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اُن کی توضیح کرائی ہے۔

حضرت شعیبؑ } اسی زمانہ میں حضرت شعیب علیہ السّلام تھے۔ جن کا سلسلہ نسب یہ ہے:۔

شعیب بن نویب بن رعویل بن مر بن عنقاء بن مدین بن ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام۔

حضرت شعیب کی زبان عربی تھی۔ وہ اہل مدین کی جانب مبعوث ہوئے تھے۔ حضرت موسیٰؑ جب فرعون سے بھاگے تو حضرت شعیبؑ ہی کے پاس پہنچے تھے۔ اور اُن کی لڑکی سے نکاح کیا تھا۔ اسی سلسلہ میں وُہ واقعات پیش آئے تھے جن کا تذکرہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے۔

حضرت ہارونؑ } اللہ تعالےٰ نے حضرت موسےٰؑ سے کلام فرمایا۔ اور اُن کے بازو کو خاص اُنہیں کے بھائی ہارونؑ کی مساعدت سے قوی کر دیا۔ خدا نے ان دونوں بھائیوں کو فرعون کے پاس پیغمبر بنا کے بھیجا تھا۔ مگر فرعون نے جب اُن کی مخالفت کی تو خدا نے اس کو غرق کر دیا۔ اور وہ

دریا میں ڈوب گیا۔

تیہ بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو حکم دیا تھا۔ کہ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر لے جائیں۔ اور میدان میں چلے جائیں بنی اسرائیل تعداد میں اتنے تھے کہ چھ لاکھ تو اُن میں بالغ متنفس تھے۔ اور نابالغوں کی تعداد ان کے علاوہ تھی جن کا کوئی حساب وشمار نہیں۔

الواح موسےؑ کی نسبت یہودی تخیّل کوہ طور پر جو لوحیں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمائی تھیں۔ وہ زمرد کی تختیاں تھیں سبز رنگ تھا۔ سونے کے حروف تھے۔ زریں کتابت تھی اور اسی حیثیت سے احکام الٰہی ان الواح میں مکتوب تھے

تابوت سکینہ حضرت موسیٰؑ جب پہاڑ کے نیچے اُترے تو کیا دیکھتے ہیں۔ کہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت اپنے ایک گوسالہ کی پُوجا کر رہی ہے۔ اور اعتکاف میں بیٹھی ہے۔ یہ دیکھنا تھا کہ حضرت موسیٰؑ فرط غضب سے لرزنے لگے۔ کانپنے لگے۔ لوحیں اُن کے پاس سے گر گئیں اور سب کی سب ٹوٹ گئیں۔ آخر ان سب کو جمع کر کے ایک تابوت (صندوق) میں رکھا جس کا نام تابوت سکینہ تھا۔ الواح کے علاوہ اس میں اور چیزیں بھی تھیں ہیکل (یعنی معبد یا قربان گاہ) میں یہ تابوت رکھ دیا گیا تھا۔ حضرت ہارون اس تابوت کے کاہن تھے۔ اور وہی اس ہیکل کے محافظ بھی تھے۔

توراۃ کا نزول تیہ بنی اسرائیل ہی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر مکمل ہوا تھا۔

حضرت ہارونؑ کی وفات

اللہ تعالیٰ نے تیہ بنی اسرائیل میں حضرت ہارونؑ کی روح قبض کی۔ اور وہ کوہ ہران میں دفن ہوئے۔ جو جبل الشراہ کے قریب کوہ طور کے مضافات میں واقع ہے حضرت ہارونؑ کی قبر مشہور ہے۔ جو ایک بہت پرانے عادی غار میں ہے (جس چیز کی تاریخ منتہائے کہنگی کے باعث قدامت کی تاریکی میں گم ہوتی ہے۔ اہلِ عرب اس کو "عادی" کہتے ہیں بنسوب بہ قوم عاد۔ یعنی نہایت قدیم)۔ بعض راتوں میں اس غار سے ایک بڑی گھنگھناہٹ کی آواز سنائی دیتی ہے۔ جس سے ہر ذی روح ڈر جاتا ہے۔

ایک ضعیف روایت یہ بھی ہے کہ حضرت ہارونؑ دفن نہیں کئے گئے۔ بلکہ اس غار میں غیر مدفون رکھے ہیں۔

اس غار کا ایک عجیب واقعہ ہے۔ جس کا تذکرہ ہم نے اپنی کتاب اخبار الزمان عن الامم الماضیۃ والامم الاٰتیۃ میں کیا ہے۔ یہاں جو پہنچا ہوگا۔ اُس کو ہماری بیان کی ہوئی کیفیت کی صحت معلوم ہو گئی ہوگی۔

حضرت ہارونؑ کی وفات کا واقعہ حضرت موسیٰؑ کی وفات سے سات مہینے پہلے پیش آیا۔ حضرت ہارونؑ کی عمر اس وقت ایک سو تیئس برس کی تھی۔ ایک ضعیف روایت یہ بھی ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے حضرت ہارونؑ کی وفات کے تین برس بعد انتقال کیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام تیہ بنی اسرائیل سے نکل کر شام میں آئے۔ جہاں اُنہیں متعدد لڑائیاں پیش آئیں۔ متعدد مہمات بھیجنی پڑیں۔ جو براہِ خشکی

بھیجی جاتی تھیں۔ یہ مہمیں اقوام (۱) عمالقہ (۲) عریانیین (۳) اہل مدین وغیرہم کے خلاف بھیجی گئیں۔ اور ان کے علاوہ اور بھی قومیں تھیں جن کا تذکرہ تورات میں موجود ہے۔ اور جن سے بنی اسرائیل کو لڑنا پڑا تھا۔

تورات } اللہ تعالےٰ نے حضرت موسیٰؑ پر اس زمانہ میں دس صحیفے نازل کئے اس سے پہلے نوے صحیفے نازل ہو چکے تھے یہ سب ملاکر سو صحیفے ہوئے۔ اس کے بعد اللہ تعالےٰ نے اُن پر تورات نازل کی جو عربی زبان میں تھی۔ اس میں امر و نہی و حلال و حرام و سُنن و احکام وغیرہا تھے۔ کتاب پانچ حِصّوں میں تھی۔ (یا بہ اصلاح یہود اس کے پانچ اسفار تھے۔) لفظ "سفر" سے صحیفہ مراد لیا کرتے تھے (یعنی تورات کے پانچ صحیفے تھے)

علمائے یہود لکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ نے تابوت سکینہ کو یعنی اُس صندوق کو جس میں احکام الٰہی کی لوحیں تھیں اور دوسرے تبرکات طاہرہ بھی تھے سونے سے ڈھلوایا تھا۔ جتنا سونا اس پر لگا تھا۔ اس کی مقدار چھ لاکھ سات سو بچاس مثقال زر تھی۔

حضرت یوشعؑ } حضرت ہارونؑ کے بعد حضرت یوشعؑ بن نون کاہن مقرر ہوئے جو حضرت یوسف علیہ السلام کے سلسلۂ اسباط میں سے تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی روح جب خدائے عز و جل نے قبض کی تو اس وقت ان کی عمر ایک سو بیس برس کی تھی۔ پیری و شیخوخت کے آثار نہ حضرت موسیٰؑ میں نمایاں تھے نہ حضرت ہارونؑ میں شباب کی کسی کیفیت میں تغیر

نہیں آیا تھا۔

فوجی پیش رفت } حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات ہونے پر حضرت یوشعؑ بنی اسرائیل کو لئے ہوئے شام کے شہروں میں چلے۔ جن پر بڑے بڑے جبار بادشاہان عمالقہ وغیرہم کہ ملک شام کے فرمانروا تھے متغلب و متصرف تھے۔ حضرت یوشعؑ نے ان کے خلاف مہمات بھیجیں۔ اور ان کے ساتھ بہت سے واقعات پیش آئے۔ آخر بنی اسرائیل نے علاقہ اریحاء کو مسخر و مفتوح کر لیا۔ جو ارض غور کا علاقہ ہے۔ اور یہ علاقہ بحیرہ منتنہ کی زمین پر واقع ہے۔ ارض غور مضافات دریا کی نشیبی زمین کو کہتے ہیں۔ اور بحیرہ منتنہ کے معنی ہیں وہ بحیرہ جس سے عفونت و بدبو آتی ہو۔

بحیرہ منتنہ } یہ وہی بحیرہ ہے جس میں غرق ہونے والوں کی لاشیں نہیں ڈوبتیں۔ اور نہ مچھلی وغیرہ کے اقسام میں سے کوئی ذی روح حیوان اس میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کا تذکرہ صاحب المنطق وغیرہ فلاسفر نے بھی کیا ہے۔ اور جو علمائے فلاسفر اس کے زمانہ کے قبل یا بعد گزرے ہیں وہ بھی اس کا ذکر کرتے رہے ہیں۔

بحیرہ طبریہ } بحیرہ طبریہ بھی منتنہ ہی میں منتہی ہوتا ہے (یعنی اول الذکر کا پانی آخر الذکر میں گرتا ہے۔ اور اسی میں یہ بحیرہ شامل ہو جاتا ہے۔ اردن بھی اسی بحیرہ طبریہ کو کہتے ہیں (لیکن یہ امر بھی ملحوظ رہے۔ کہ اردن کی ایک جداگانہ بستی بھی ہے)

بحیرہ طبریہ کے پانی کا مبدء بحیرہ کفتولی و بحیرہ فرعون ہے۔ جو دمشق کے

علاقہ میں واقع ہے۔

نہرِ اردن } نہر اردن کا پانی جب بحیرہ منتنہ میں گذرتا ہے۔ تو اُسے چیرتا ہؤا گذرتا جاتا ہے۔ اور اُس کے وسط تک پہنچ کے بحیرہ منتنہ کے پانی سے الگ ہوجاتا ہے۔ اور پھر اُسی میں رل مل جاتا ہے۔ یہ ایک نہر عظیم ہے با ایں ہمہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس کا پانی بحیرہ منتنہ میں کس جگہ جا کر مل جل گیا ہے اُس جگہ کی تعیین نہیں ہوسکتی۔ پھر لطف یہ ہے کہ اتنی بڑی نہر کا پانی شامل ہوجانے پر بھی بحیرہ منتنہ کا پانی نہ بڑھتا ہے نہ گھٹتا ہے۔

بحیرہ منتنہ کے بعض خصائص } بحیرہ منتنہ سے بڑے بڑے عجیب عجیب واقعات وحالات تعلق رکھتے ہیں۔ اس بحیرہ کا ایک طویل قصہ بھی ہے۔ ہم نے یہ تمام باتیں اپنی تاریخی تصنیف کتاب "اخبار الزمان عن الامم الماضیۃ والملوک الدائرہ" میں درج کی ہیں۔ اس نام کے لفظی معنی یہ ہیں کہ وہ کتاب جس میں زمانہ بھر کے متعلق حالات ومعلومات واطلاعات جمع ہیں۔ جن کو گذشتہ اقوام اور سابق کے سلاطین کے ساتھ کسی قسم کا علاقہ ہوسکتا ہے۔

حجر الیہود } ہم نے اخبار الزمان میں اُن پتھروں کے حالات بھی درج کئے ہیں جو بحیرہ منتنہ سے نکلتے ہیں۔ اِن میں ایک قسم کا وہ پتھر ہے جو خربزہ کی شکل کا ہوتا ہے۔ یہ دو طرح کا پتھر ہوتا ہے۔ ایک کو حجر الیہود کہتے ہیں اس کا تذکرہ فلاسفہ نے بھی کیا ہے۔ اور طب میں بھی اس کا استعمال اُن لوگوں کے لئے ہوتا ہے جنہیں ریگ مثانہ کا درد لاحق ہو۔ یہ دو نوع کے پتھر ہیں۔ نر و مادہ۔

نرتو مردوں کے لئے ہے۔ اور مادہ عورتوں کے لئے۔

بحیرہ کنود ان } خدا خوب جانتا ہے۔ مگر جہاں تک میں جانتا ہوں دُنیا میں کوئی ایسا بحیرہ نہیں جس میں مچھلی وغیرہ کوئی ذی روح آبی جانور پیدا نہ ہوسکتا ہو۔ اگر ہے تو ایک یہی بحیرہ منتنہ ہے۔ اور دُوسرا ایک اور بحیرہ ہے جس میں خود میں نے علاقہ آذربایجان میں سفر کیا ہے۔ اور یہ سفر شہر ارمینیہ سے مقام منارہ تک طویل رہا ہے۔ اس کو بحیرہ کنود ان کہتے ہیں۔ اور وہاں یہ اسی نام سے مشہور ہے۔

قدمائے اہل علم نے بحیرہ منتنہ میں دریائی جانوروں کے پیدا نہ ہوسکنے کی وجہ تو بیان کی ہے۔ مگر بحیرہ کنود ان سے کسی نے تعرض نہ کیا۔ ان لوگوں کا قول اگر صحیح ہے۔ تو اسی پر قیاس کر کے کہہ سکتے ہیں کہ ان دونوں دریاؤں کا سرچشمہ ایک ہوگا۔

فتوحات } بادشاہ شام کو سمیدع بن ہوبر بن مالک تھا۔ حضرت یوشعؑ کے مقابلہ کو چلا۔ ان کے آپس میں لڑائیاں ہوتی رہیں۔ تا آنکہ حضرت یوشعؑ نے سمیدع کو قتل کر ڈالا۔ اور اُس کے سارے مُلک پر حاوی و قابض ہو گئے۔ اور اُس کے اور بھی بہت سے جبار تھے۔ سرداران عمالقہ تھے کہ حضرت یوشعؑ کی فتوحات سے ان سب کا بھی وہی حشر ہُوا۔ جو سمیدع کا ہُوا تھا۔ یوشعؑ نے ارض شام میں حملے بھی کئے۔ جنگ بھی کرتے رہے۔ شبخون بھی مارے۔ اور آخر عہد تک اس سلسلہ کو جاری رکھا۔

یوشعؑ کی وفات } حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد انتیس برس تک حضرت یوشعؑ کا زمانہ رہا۔ اور پھر

انتقال کر گئے۔ اُن کا سلسلہ نسب یوں ہے:۔

یوشع بن نون بن افرائیم بن یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام۔

جنگِ عمالقہ ایک ضعیف روایت یہ بھی ہے کہ بادشاہ عمالقہ سے کہ سمیدع تھا۔ یوشع بن نون کی ابتدائی جنگ کا واقع مقام ایلہ میں پیش آیا۔ جو شہر مدین کے متصل ہے (بہر حال یہ روایت خواہ کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ اور اس جنگ کا میدان خواہ کوئی بھی رہا ہو۔ اس میں تو کلام نہیں کہ) عوف بن سعید جرہمی نے اس واقعہ کے متعلق کہا تھا۔

الم تران العلقمی بن ھویز:۔ اے ہمنشین کیا تو نے یہ نہیں دیکھا۔ اور تیری نظر سے یہ واقعہ نہیں گذرا کہ علقمی بن ہویز کا)

بایلۃ امسیٰ لحمہ قد تمزعا:۔ (ایلہ میں خاتمہ ہو گیا۔ اور خاتمہ اس بُری طرح ہُوا۔ کہ اُس کا گوشت تک پارہ پارہ ہو گیا)

تداعت الیہ من یھود جحافلٌ:۔ قوم یہود کے بہُت سے سربرآوردہ وسرخیل وسردار اُس پر پل پڑے۔ اُس کے درپے ہو گئے۔ اُس سے لڑنے لگے)

ثلاثون الفاً حاسرین و دداعا:۔ (ان یہودی حملہ آوروں کی تعداد تیس ہزار تھی۔ جن میں بہتیرے برہنہ سر تھے۔ اور بہت سے زرہ پوش اور مسلح تھے)

فامست عداداً للعمالیق بعدہٗ:۔ (اس شدید حملہ اور عظیم حربہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ عمالقہ کی تعداد نے علقمی بن ہویز کے بعد اس حالت میں شام کی۔)

علے الارض مشیاً مصعدین و فزعاً (کہ زمین پر چلتے تو تھے مگر ڈرے

جاتے تھے۔ ایک کے اوپر ایک چڑھے جاتے۔ پہاڑوں پر پناہ لے رہے تھے۔ اور خوف سے تھراتے تھے)

کان لم یکونوا بین الجبال مکۃ:۔ (حالت ایسی تھی۔ کہ گویا کوہستان مکہ کے درمیان عمالقہ کا وجود ہی نہ تھا۔ اور یہ لوگ پیدا ہی نہ ہوئے تھے)

ولم یر راءٍ قبل ذالک السمید عا:۔ (اور کسی دیکھنے والے نے اس حالت سے پیشتر سمیدع کو دیکھا ہی نہ تھا۔ یعنی اس کی ابتدا و انتہا یہی تھی کہ قتل ہو کر دنیا سے معدوم ہو گیا)

بلعم باعوراء } ارض بلقاء جو بلاد شام میں واقع ہے۔ یہاں کے ایک گاؤں میں ایک شخص رہتا تھا۔ جسے بلعم باعوراء کہتے تھے۔ اس کا سلسلہ نسب حسب ذیل ہے:۔

بلعم بن باعورا بن ستور بن وسیم بن ناب بن لوط بن ہاران۔

بلعم مستجاب الدعوات تھا۔ اور خدا اُس کی دعائیں قبول کر لیا کرتا تھا۔ قوم نے اُس کو اُبھارا۔ آمادہ کیا۔ برانگیختگی پیدا کرنی چاہی۔ کہ حضرت یوشع کے حق میں بد دُعا کرے۔ وہ یہ تو نہ کر سکا۔ البتہ عمالقہ کے بعض بادشاہوں کو اشارہ کر دیا کہ حضرت یوشعؑ کی فوج کے سامنے حسین حسین عورتیں لائیں عمالقہ اس تدبیر پر کاربند ہوئے اور بنی اسرائیل فی الفور عورتوں کے پیچھے پڑ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ افواج بنی اسرائیل میں طاعون پھیل گیا۔ اور ستر ہزار یہودی اس بیماری سے ہلاک ہو گئے۔

ایک ضعیف روایت وفات یوشعؑ کے متعلق یہ بھی ہے کہ خدائے عزّوجل نے جب اُن کی روح قبض کی ہے۔ تو اُس وقت وہ ایک سو برس کے تھے۔

حضرت یوشعؑ کے بعد کالب بن یوفنا بن بارض بن یہودا بنی اسرائیل کے سرگروہ ہوئے۔ یوشع و کالب وہی دونوں بزرگ ہیں۔ جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا تھا۔ اور نعمت الٰہی ان کو عطا ہوئی تھی۔

علامہ مسعودی فرماتے ہیں :۔

سرداران بنی اسرائیل میں نے ایک کتاب میں دیکھا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے خلیفہ تو حضرت یوشعؑ ہوئے ہی تھے۔ مگر یوشعؑ کی وفات پر "وشان الکعری" سرگروہ بنی اسرائیل قرار پائے۔ جو اٹھ برس تک ان میں رہے۔

وشان کے بعد عمایل بن قانم صاحب اختیار ہوئے۔ جو سبط یہودا میں سے تھے۔ چالیس برس تک اُن کا زمانہ رہا۔

ایک ضعیف روایت یہ بھی ہے۔ کہ علاقہ بلقاد کے مقام آب کا بہت بڑا جبار جس کا نام کوش تھا۔ وشان کے بعد وہ خلیفہ بنی اسرائیل بن بیٹھا۔ اس واقعہ کے بعد بنی اسرائیل نے کفر کا شیوہ اختیار کر لیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اُن پر کنعان کو حاکم بنایا۔ جو دس برس تک حکومت کرتا رہا۔ کنعان کے خاتمہ پر علان اخباری نے چالیس برس فرمانروائی کی۔ اور پھر سمویہ کو سرداری ملی۔ تا آنکہ طالوت نے زمام اختیار ہاتھ میں لی۔ اور بنی اسرائیل پر جالوت جبار نے خروج کیا۔ جو علاقہ فلسطین کے بربروں کا بادشاہ تھا۔

پہلی روایت مقدمۃ الذکر کے مطابق بنی اسرائیل و مدبر حکومت فنحاص العازر بن عمران علیہ السلام تھے۔ جو تیس برس تک خلیفہ رہے۔

صحف موسوی کی حفاظت } حضرت موسیٰؑ علیہ السلام پر جو صحیفے نازل ہوئے تھے۔

فنحاص نے اپنے عہد حکومت میں انہیں تانبے کے ایک صندوقچہ میں بند کر کے اُس کے ڈھکنے کو پگھلے ہوئے رنگ سے جوڑ دیا۔ اور صندوقچہ کو بیت المقدس کی صخرۂ صماء کے پاس لائے۔ یہ اُس وقت کا واقعہ ہے جب بیت المقدس کی تعمیر نہیں ہوئی تھی۔

پتھر (صخرہ) پھٹ گیا۔ اور ایک غار نظر آیا جس میں ایک دوسرا پتھر بھی تھا۔ فنحاص نے صندوقچہ کو اُسی میں رکھ دیا (صحیفوں کا اس طرح رکھا جانا ہی تھا) کہ پتھر پھر جڑ گیا۔ اور جیسا پہلے تھا۔ ویسا ہی ہو گیا۔ (یہ روایت بھی حسب معمول یہودیوں کی ہے)۔

والیان یہود } فنحاص بن العاذر کی وفات پر کوشان بن لاسم فرماں روا ہوا جو الجزیرہ کا بادشاہ تھا۔ اس نے بنی اسرائیل کو غلام بنا لیا۔ اور آٹھ برس تک یہ قوم ابتلا میں گھری رہی۔

کوشان کے بعد عثنیئال بن قناز کو تولیت ملی۔ جو سبط یہودا میں سے تھا۔ اور کالب کا بھائی تھا۔ یہ تولیت و حکومت چالیس برس تک قائم رہی۔

والیان ما بعد کی فہرست ملاحظہ ہو:۔

عقلون بادشاہ ہاب۔ یہ سخت کوشش کے بعد فرمانروا ہوا۔ اور اٹھارہ برس تک حکومت کی۔

اہوذ۔ از نسل افرائیم عہد حکومت ۲۵ سال تھا اہوذ کی عمر جب ۳۵ برس کی ہوئی تو اُس زمانہ میں دنیا جہان کی آبادی کو چار ہزار برس گذر چکے تھے۔ اس تاریخی مدت کے متعلق بعض روایات ضعیفہ اور بھی ہیں۔

ساعان بن اہوذ۔ حکومت ۲۵ برس۔

یابین کنعانی بادشاہ شام۔ حکومت ۲۰ برس۔

دبورا۔ یہ ایک عورت تھی۔ اور ایک ضعیف روایت ہے۔ کہ اس فرماں روا عورت کی لڑکی کا نام دبورا تھا۔ اس نے سبط نفتالی کے ایک شخص کو جس کا نام بازاق تھا۔ فرماں روائی میں شامل کر لیا۔ حکومت ۴۰ سال۔

جوسائے پنج گانہ بنی اسرائیل۔ حریب۔ ربیب۔ برسونا۔ رع یصلناع حکومت نو برس تین مہینے۔

کدعون از آل میشا۔ حکومت چالیس برس ضعیف روایتوں میں میشا کی جگہ ملوک دین کا نام بھی آیا ہے۔

ایمالخ بن میشا۔ حکومت تین برس تین مہینے۔

تو بع از آل فرائن حکومت ۲۳ برس۔

سابہ از آل میشا۔ حکومت ۲۲ برس۔

ملوک مان۔ حکومت ۱۸ برس ۳ مہینے۔

بحشون از بیت لحم۔ حکومت سات برس۔

بادشاہان فلسطین جو بنی اسرائیل پر غالب آئے تھے۔ حکومت چالیس برس۔

عالی کاہن ۔حکومت چالیس برس۔

حملۂ بابل } عالی کاہن ہی کے عہدِ حکومت میں بنی اسرائیل پر اہلِ بابل ظفریاب ہوئے۔ اور تابوت سکینہ کو اُن سے چھین کر مالِ غنیمت میں بابل اُٹھا لے گئے۔ یہ وہی (مقدس) تابوت تھا جس کی برکت سے بنی اسرائیل فتح و ظفر کے طلبگار ہوتے تھے۔ اور جس میں پیغمبروں کے تبرکات تھے (مثلاً الواحِ موسےٰ کے ٹکڑے وغیرہا) افواج بابل نے اس حملہ میں بنی اسرائیل کو اُن کے گھر بار اور علاقوں سے نکال دیا۔ بے دخل کر دیا۔ اور اُن کی اولاد بھی خارج الدیار کر دی گئی۔

قوم حزقیل } جب اہلِ بابل نے حملہ کیا۔ تو قوم حزقیل قتال سے جان بچا کر بھاگ گئی تھی (حزقیل یہودیوں کے مقتدائے روحانی یا پیغمبر تھے۔ اور اُن کی قوم بھی من جملۂ قوم یہود ہی تھے۔ یہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ اور موت کے خوف سے گھر بار چھوڑ کے بھاگ گئے تھے۔ اللہ تعالےٰ نے پہلے تو اُن کو مُردہ کر دیا۔ پھر اُنہیں زندگی عطا کی۔ طاعون لاحق ہؤا۔ اور اس شدت سے لاحق ہؤا۔ کہ اُن میں سے فقط تین اسباط باقی رہ گئے۔ ایک فرقہ ریگستان میں چلا گیا۔ ایک فرقہ نے پہاڑوں کی چوٹیوں پر پناہ لی۔ اور ایک فرقہ سمندر کے ایک جزیرہ میں پناہ گیر ہؤا۔ ان کا واقعہ بہت دراز ہے۔ تاآں کہ یہ لوگ اپنے ملک میں واپس آئے۔ اور حضرت حزقیل سے پوچھا کہ "آپ نے کیا ایسی کوئی دوسری قوم بھی دیکھی ہے۔ جس پر ہم جیسی مصیبت نازل ہوئی ہو؟" حزقیل نے جواب دیا "نہیں۔ میں نے کوئی دوسری قوم ایسی نہیں دیکھی

اور نہ ایسے لوگ ہی دیکھے سُنے ۔جو تمہاری طرح خدا سے بھاگے ہوں ۔"
آخر اللہ تعالےٰ نے اِن لوگوں پر سات دِن کا طاعون نازل کیا۔اور
یہ سب لوگ ہلاک دتباہ و برباد ہو گئے ٭
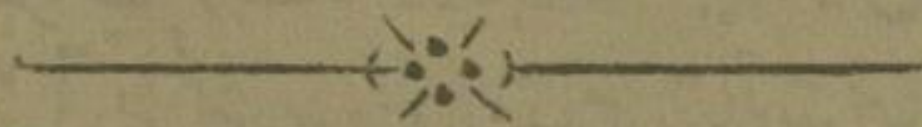
مروج الذہب کا سلسلہ اگرچہ اپنی طوالت کے اعتبار سے اس
قسم کے سینکڑوں صفحات پر حاوی ہو سکتا ہے لیکن قدرت کی
ان ابوجھی مصلحتیں بعض اوقات انسانی جوشِ عمل کو ایک معینہ
راہ پر گامزن نہیں رہنے دیتیں ۔یہی حادثہ اس مرحلہ پر بھی رونما
ہؤا۔مولینا ظفر علی خاں بعض غیر اختیاری مصروفیات میں
اس درجہ منہمک ہونے پر مجبور کیے گئے ۔کہ یہ سلسلہ یہیں ختم
کرنا پڑا۔لیکن اس کتاب میں مروج الذہب کے علاوہ جو
مضامین ہیں وہ اس کمی کو پورا کر سکیں گے ٭ (مرتب)

غلامانِ اسلام

ملک عنبر حبشی وزیرِ دکن

غلامِ نرگسِ مستِ تو تاجدارانند
خرابِ بادۂ لعلِ تو ہوشیارانند

غلامانِ اسلام

ملک عنبر حبشی وزیرِ دکن

(۱)

اسلام کا اپنے غلاموں کے ساتھ کیا برتاؤ تھا؟ اہلِ نظر نے اس باب میں بڑی دیدہ ریزی کی ہے۔ لیکن تنقیح مباحث کے بہترین ذرائع اگر واقعات ہیں۔ تو ہم اس ذیل میں ملک عنبر حبشی کے واقعات زندگی پیش کرتے ہیں۔ جو ایک ادنیٰ درجہ کا غلام تھا۔ مگر اسلام نے اس کے ساتھ وہ سلوک کیا جس کی حضرت امیر خسرو دہلوی پہلے ہی پیشین گوئی کر چکے تھے کہ ؎

داغ غلامیت کرد پایہ خسرو بلند
میرِ ولایت شود بندہ کہ سلطاں خرید

خود ملک عنبر کو بھی اپنے زمانۂ عروج میں غلاموں کی خریداری سے کچھ کم شغف نہ تھا جن کے ساتھ اس کے برتاؤ کی شرح بھی سن لیجئے۔ مؤرخین عرب لکھتے ہیں:-

اکثر من شراء الحبوش وکانت التجار تجلبهم الیه و یتغالون فی اثمانهم الی ان اکثروها جدا۔ یقال ان جملة ما اشتراه من الذکور نحو الفی حبشی۔

ملک عنبر نے بکثرت حبشی غلام خریدے بردہ فروش سوداگر، ان غلاموں کو اس کے پاس لاتے تھے۔ اور بڑی قیمتیں لیتے تھے۔ حتیٰ کہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی۔ کہا جاتا ہے کہ دو ہزار حبشی غلام اس نے خریدے تھے۔ لونڈیاں ان کے علاوہ تھیں۔

وکان الجلب اول ما یشتریه یسلمه الی من یعلمه القرآن والخط۔ ثم الی من یعلمه الفروسیة واللعب بالسیف والعود والسهام الی ان یتفرس فی انواع الحرب والحیل والخداع ثم یترقی و ترقون فی المراتب و فی المناصب کل به داستحقاقه ومرتبته

غلام جب آتے تو خریدنے کے بعد پہلے انہیں تعلیم دینے والوں کے سپرد کیا جاتا۔ تاکہ قرآن کریم اور کتابت کی تعلیم دیں۔ جب اس تعلیم سے فارغ ہوجاتے تو فن حرب کی تعلیم دلائی جاتی کہ شمشیر بازی گدکے بازی۔ تیر اندازی میں کمال حاصل کریں۔ انواع علم حرب و تدابیر جنگ میں مہارت ہوجانے پر ان کو ترقی دی جاتی۔ ہر ایک کا مرتبہ و

منصب ترقی مختلف ہوتا۔ جو جس قدر کوشش کرتا اور جیسی ترقی کا مستحق ہوتا ویسا ہی رتبہ اُسے ملتا۔

وكان لهم اعتنا باقامة الجماعة وامور الدين وكان لكل امير منهم فقيهٌ يتعلم منه الفقه واصول الدين وامام يصلي به مؤذنٌ وجماعة يتدارسون القرآن و جماعةٌ يذكرون الله تعالىٰ ليلة الجمعة والاثنين ولكل امير سماطٌ۔ مملوءٌ بانواع الاطعمة الفاخرة۔

یہ حبشی غلام رفتہ رفتہ افسر ہو جاتے وجماعت قائم کرنے اور مذہبی امور سے دلچسپی رکھتے ہیں اُن کو خاص انہماک تھا۔ ہر ایک افسر کے ہمرکاب ایک عالم (فقیہ) رہتا۔ جو اُسے فقہ و دینیات کی تعلیم دیا کرتا۔ ایک امام ہوتا جس کے پیچھے وہ نماز پڑھتا۔ ایک مؤذن ہوتا جو اذان دیا کرتا۔ ایک جماعت ہوتی جو قرآن کریم کا باہم درس دیا کرتی۔ اور دُوسری جماعت بھی ہوتی جو شب جمعہ و شب دوشنبہ کو احیائے لیل کرتی اور رات بھر عبادت کیا کرتی۔ ہر افسر کا دستر خوان عام ہوتا۔ جس پر طرح طرح کے اعلیٰ اعلیٰ الوان طعام ہوتے۔

وبالجملة فانهم وان كانوا عبيد حبشة فلم تكن العرب تفوقهم

غرض کہ یہ غلام اگرچہ حبشی غلام تھے مگر عرب کو اُن پر فوقیت تھی نہ صرف

اِلّا بالنسب۔ شرافت نسبی کی فوقیت تھی۔

شرافت نسبی کی جس فوقیت و فضیلت کو اہلِ عرب کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔ اسلام اُس کو تسلیم نہیں کرتا۔ کہ مدارِ شرافت تقوٰی ہے۔ تفاخر خاندانی نہیں ہے۔ بپرسند کہ عملت چیست ونپرسند کہ پدرت کیست ع

کاندریں راہ فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست

(۲)

فارسی و انگریزی و عربی تاریخیں ملک عنبر کے نہایت سرسری وسطحی حالات پر قانع ہیں۔ ملک عنبر کا عہد اگرچہ تمدن عرب کا عہد زوال تھا۔ مگر مؤرخین عرب کے خصائص تاریخی اُس وقت بھی معدوم نہ ہوئے تھے۔ علامہ شِلی و علامہ محبی نے ملک عنبر کے اہم سوانح زندگی بڑی متانت سے قلمبند کر دیئے ہیں۔ اگر یہ کتابیں نہ ہوتیں تو دُنیا کو شاید اِن حقائق کے بے نقاب ہونے کے لئے ابھی بہت زمانہ تک انتظار کرنا پڑتا۔

اوّل الذکر کا پورا نام محمد بن ابی بکر بن احمد بن ابی بکر الشبلی الحضرمی ہے۔ یہ ارض یمن و عرب کا نہایت نامور مصنف و مورّخ تھا۔ شیخ عبد القادر بن المجید روس کی مشہور کتاب "النور السافر فی اعیان القرن العاشر" پر اُس نے ایک تکملہ لکھا ہے اور ایک خاص کتاب "اخبار اعیان القرن الحادی عشرہ" تالیف کی ہے۔ جس میں ملک عنبر کے نہائیت مفصّل حالات درج ہیں۔ یہ دونوں کتابیں قلمی ہیں لیکن آخر الذکر (علامہ محمد المحبی) کی تالیف "خلاصۃ الاثر فی اعیان القرن الحادی عشر" مصر میں چھپ چکی ہے۔ جس کی تیسری جلد (صفحہ ۲۳۲ و ۲۳۳) میں ملک عنبر کے

واقعات مرقوم ہیں۔ مگر یہ بھی بعض فاش اغلاط سے خالی نہیں۔ جن سے ہم کو تعرض نہیں۔ مگر ہم نے اُن کی تصحیح میں کوتاہی روا نہیں رکھی ہے۔
مقام غور ہے کہ ہندوستان اپنے ایک رکن رکین کے تذکرے سے تقریباً خاموش محض ہے۔ مگر عرب جنہیں اُس سے بہت کم تعلق تھا اس کے سوانح لکھتے ہیں اور نہایت مفصّل سوانح لکھتے ہیں۔

(۳)

دسویں صدی ہجری کے نصف آخر میں ارض حبشہ (ابی سینیا) کا قبیلہ "مّاریہ" کمال بے مائگی کی وحشیانہ زندگی بسر کرتا ہے۔ شہر "انحرہ" میں اس قبیلہ کی بود و باش ہے۔ جہاں اس کے ایک فرد کے گھر میں لڑکا پیدا ہوتا ہے۔ جس کا نام "شنبو" رکھا جاتا ہے۔ کہ ہمارے ہندوستانی لفظ "شنبھو" کا مرادف ہے۔
شنبو کی طفولیت ویسی ہی ہے۔ جیسے تمام وحشی قبائل کے لڑکوں کی ہوتی ہے۔ افلاس و ناداری سے تنگ آ کر ماں باپ اس کو بیچ ڈالتے ہیں۔ بردہ فروش اس کو مکۂ مبارکہ لے جاتے ہیں۔ جہاں کے قاضی القضات (حسین) اس حبشی کو خرید لیتے ہیں۔ اپنے لڑکوں کی طرح اس کی تربیت کرتے ہیں تعلیم دیتے ہیں تہذیب سکھاتے ہیں۔ حتٰی کہ مدنیت عرب و علوم اسلام اُسے اپنا بنا لیتے ہیں۔ اور اب وہ ایک ذی علم و شائستہ انسان ہو جاتا ہے۔
"قاضی حسین کے انتقال پر تقدیر اس حبشی غلام (شنبھو) کو پھر نخاس (بازار بردہ فروشی) میں لاتی ہے۔ اور حالتِ غلامی اس کو عرب سے

ہندوستان پہنچاتی ہے۔ سلطنت ہند کا ایک امیر جس کا نام عربی خراد پر چڑھ کر "نجس خاں" ہو گیا ہے۔ شنبھو کو خرید لیتا ہے۔ اور جنگ و جدال کی فطری استعداد دیکھ کر اس کو فن حرب و آداب قتال کی تعلیم دلاتا ہے جس میں وہ بہت جلد ترقی کر کے ماہر فن ہو جاتا ہے۔ اور اب اُس کی حیثیت ایک ایسے صاحب سیف والعلم کی ہو جاتی ہے جس کی تلوار قلم کا اور قلم تلوار کا کام دیتا ہے۔ ہندوستان کی قدردانی سرگین حبش کو "عنبر" بنا دیتی ہے۔ اور اس وقت سے وہی غلام حبشی (شنبھو) "ملک عنبر" کے لقب سے رائحہ شہرت کی مشام آسائی کرتا ہے ؂

(۴)

دکن کی سلطنت بہمنیہ مٹ چکی ہے۔ اور پانچ مختلف حکومتیں اُس کی جانشین ہوئی ہیں جن میں ایک عادل شاہیوں اور ایک نظام شاہیوں کی حکومت ہے۔ عادل شاہیوں کا مرکز بیجاپور ہے۔ اور اُس کا مورث ایک عثمانی ترک (یوسف آفندی) ہے جو سلطان مراد خاں عثمانی کا سب سے چھوٹا شاہزادہ ہے۔

جب باپ کا انتقال ہوتا ہے۔ اور تخت سلطنت قسطنطنیہ سلطان محمد خان کو ملتا ہے۔ تو اُس کا چھوٹا بھائی یوسف آفندی جلا وطن ہو کر ہندوستان پہنچتا ہے۔ جہاں بہمنیوں کے سلک سلطنت میں منسلک ہو جاتا ہے۔ اور "عادل خاں" کا خطاب پاتا ہے۔ بیجاپور کی گورنری عطا ہوتی ہے۔ جو زوال سلطنت کے دنوں میں عادل خاں کی کوشش سے ایک آزاد خود مختار حکومت کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی اس حکومت کا فرماں روا ہے۔ جو ۹۸۸ھ میں تخت نشین ہؤا ہے۔ جس کا دربار ملک عنبر کو بھی جذب کر لیتا ہے۔ اور حکومت کا ایک ممتاز عہدہ اس کو عنایت ہوتا ہے۔

ملک عنبر کے مزاج میں عربیت غالب ہے۔ نامورانِ عرب کی ایک بڑی جماعت اس کی حاشیہ نشین ہے جس کے ہر فرد کے لئے وظائف و مناصب مقرر ہیں۔ جو عرب ہندوستان آتا ہے۔ ملک عنبر اس کی شاہ نوازی کرتا ہے۔ اور اسپی مشعلِ فروزاں بحرِ روح پرور کے لمعاتِ کرم اُس کی تواضع کرتے ہیں

دربار عادل شاہی کے بعض منصب پر وُہ فائز ہے۔ میزانِ مخارج میں اُس کے مذاق کا پلہ ہمیشہ بھاری رہتا ہے۔ ملک عنبر اضافۂ منصب کی درخواست کرتا ہے جو مقبول نہیں ہوتی ہے۔ ناچار ۱۰۱۰ھ میں ترکِ منصب کر کے بیجاپور سے چل دیتا ہے کہ ؎

ہمائے گو مفگن سایہ شرف زنہار
دراں دیار کہ طوطی کم از زغن باشد

(۵)

غربت کا عالم ہے۔ بے نوائی دامنگیر ہے۔ وہی سر جس کے ردائے عشرت زیبِ آغوش تھی۔ اس وقت اُس کے لئے گلیمِ عُسرت بار دوش بنا ہؤا ہے لیکن اس حال میں بھی ملک عنبر کی جمعیتِ باطن کی طرح جمعیتِ ظاہر میں بھی کوئی خلل نہیں پڑتا۔ تمام عرب اُس کے ساتھ ہیں کہ مسلم کامل وُہی ہے جو خدا کے فضل سے اپنی قابلیت پر ہر حال میں واثق ہو۔ اور بجائے اس کے

کہ انقلابِ ایام سے مجبور رہو کر زمانہ کا ساتھ دے۔ خود زمانے کو اپنا ساتھ دینے پر مجبور کرے۔ ملک عنبر کی ساری زندگی اسی فلسفۂ حسیات کی تفسیر ہے۔

انبوہ عرب جو ملک عنبر سے فیضیاب تھا۔ اس سازو برگ کی حالت میں بھی اس کے ساتھ مرگ انبوہ کا جشن منا رہا ہے۔ اور کسی کی اخلاص مندی اس کی رفاقت طلب کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی ہے۔ ایک روز اسی بے زری میں "کاربہ جان دکار دیا سنخوان" تک کی نوبت آجاتی ہے۔ اتفاق سے ایک قدیم دفینہ ہاتھ آتا ہے۔ ملک عنبر خدا کا شکر بجالاتا ہے۔ اور اس خداداد خزانہ کو افزائش خیل وحشم میں صرف کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ ایک بڑی فوج مرتب کرلیتا ہے۔ اور ملک گیری شروع کردیتا ہے۔

اُن دنوں عرصۂ دکن آشوب گاہ فتن ہو رہا تھا۔ ایک طرف تو سلطنت مغلیہ دہلی اس ملک کے مسخر کرنے کی فکر میں تھی اور دوسری جانب ملوکِ دکن کی باہم آویزی خود ان کو تباہ کر رہی تھی۔ ملک عنبر نے موقع مغتنم سمجھ کر بہت سے علاقے فتح کر لئے۔ جو باہم خانہ جنگیوں سے پامال ہو رہے تھے۔ اور جس کی رعایا کو ایک دن کے لئے بھی عافیت نصیب نہ تھی۔ ملک گیری کے ساتھ ملک داری بھی بڑی چیز ہے۔ اور یہ دونوں اوصاف ملک عنبر میں یکساں موجود تھے۔ اُس نے ان اضلاع مفتوحہ میں جو جو انتظامات کئے حسب روایت مجتبیٰ وہ حسب ذیل تھے:-

(۱) شکستہ دل رعایا کو ہر طرح سے خوش کر کے اپنا دوست بنالیا۔

(۲) توسیع عدل وانصاف میں ذرہ برابر کوتاہی روا نہ رکھی *

(۳) زیر دستوں کے ساتھ احسان کرنا اس کی حکومت کا خاص شعار تھا۔
(۴) اس کی حکومت میں انتظامی و عدلی اختیارات علیحدہ علیحدہ افسروں کے سپرد تھے ہوتے تھے۔ حاکم شہر کے ہاتھ میں انتظام تھا جس کو محکمہ عدالت سے کچھ تعلق نہ تھا۔ اور اس صیغہ پر وہ کوئی اثر نہیں رکھتا تھا۔ محکمہ عدالت کی ذمہ داری قاضی سے متعلق ہوتی تھی جسے انتظامی معاملات سے کوئی سرو کار نہیں ہوتا تھا۔ یہ دونوں محکمے ہر مقام پر قائم تھے۔ اور جدا جدا اپنے اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔

(۶)

سلطان احمد شاہ بہمنی کے عہد میں ایک ہندو لڑکا (تیما بھٹ) بھی اسیرانِ جنگ بیجا نگر کے زمرہ میں نظربند تھا۔ پادشاہ نے اس کو آزاد کر دیا۔ اور وہ مسلمان ہو گیا۔ یہ لڑکا تعلیم سے بہرہ مند تھا۔ فارسی تعلیم پادشاہ کے حکم سے اس کو شاہزادہ ولی عہد کے ساتھ دی گئی تعلیم کے مکمل ہوجانے پر عہدۂ خوش بیگی عطا ہؤا۔ جو ترکی اصطلاح میں شکاری جانوروں کی دار وغگی کے مرادف تھا۔ بعد میں ترقی کرتے کرتے سلطنت کا ایک رکن رکین بن گیا حتٰی کہ زوالِ سلطنت کے زمانہ میں اپنی مستقل حکومت قائم کر لی جس کا مستقر دولت آباد و احمد نگر تھا۔

ابراہیم نظام شاہ کے بعد نظام شاہیوں کی حکومت اس قدر متزلزل ہو گئی تھی کہ اُس کے انتقال پر شاہی خانوادے میں سے کسی کو تاج و تخت نصیب نہ ہو سکا۔ امرائے دولت کی سازش سے ۱۰۰۳ھ میں ایک بیگانہ شخص بادشاہ بنایا گیا۔ اسی زمانہ میں عساکر مغلیہ کے متواتر حملوں نے اس

آزاد مملکت کی بیخ کنی کا پورا سامان کرلیا تھا۔ مگر شاہزادی (چاند سلطانہ) کی سیاست اُس وقت کام آئی۔ جس نے مُلک کو بھی تباہی سے بچا لیا۔ اور اصلی وارثِ حکومت (بہادر نظام شاہ) کو زمام فرماں روائی بھی واپس دلادی۔

۱۰۰۸ھ میں بہادر نظام شاہ کی خود مختاری سلب ہوگئی۔ امرائے نظام شاہ کی بے تدبیری نے شاہزادی چاند سلطانہ کی اطاعت نہ کی۔ اور سلطنت کھودی۔ شہزادی شہید کروالی گئیں۔ اور افواج اکبر شاہی نے شیخ ابوالفضل کی سرلشکری میں دار الملک پر حملہ کرکے بہادر نظام شاہ کو قید کرلیا۔ جسے شہنشاہ اکبر کے حکم سے قلعہ گوالیار میں جگہ دی گئی۔

اس نازک وقت میں مرتضےٰ نظام شاہ تخت نشین ہؤا۔ جسے از سرنو بنیانِ سلطنت استوار کرنے کے لئے ملک عنبر سے مدد لینے کی ضرورت پڑی یہی زمانہ ہے جس میں ملک عنبر کے جوہرِ قابلیت کا سارے ہندوستان کو اعتراف کرنا پڑا۔ اور ہندوستان ہی نہیں عرب وعجم میں بھی اس کے حسنِ سیاست کی دھوم مچ گئی ؎

(۷)

ملک عنبر کو حکومت نظام شاہیہ کے لئے متعدد کام کرنے تھے۔ اور مختلف مہمات امور انجام دینے تھے۔ جن میں سے ہر ایک کی اہمیت فائق الوصف تھی :-

(۱) حکومت کی گئی ہوئی آزادی بقدر امکان واپس لانی تھی۔

(۲) ارکانِ حکومت جتنے بھی تھے "انا ولا غیری" کے مدعی تھے ان میں

کوئی کسی کی بات نہیں مانتا تھا۔ اور نہ خود فرماں روائی کی اطاعت کرتا تھا۔ ان سب کو ایک ضابطہ کے اندر لاتا تھا۔ اور ایک نظام کے ماتحت بنانا تھا۔

(۳) اندرونی خانہ جنگیوں کا سلسلہ کوتاہ کرنا تھا۔

(۴) مغلوں کے بیرونی حملوں کی روک تھام کرنی تھی۔

(۵) منافقوں کی ریشہ دوانیوں کا خاتمہ کرنا تھا۔ جو خود سلطنت کا خاتمہ کیئے دیتی تھیں۔

(۶) ذاتی حیثیت بھی مضبوط بنانی تھی۔ اور اس درجہ مضبوط بنانی تھی کہ مخالفین کا داؤ نہ چل سکے۔

(۷) انتظامی۔ عدلی۔ فوجی۔ مالی اصلاحیں کرنی تھیں۔ جن کے بغیر امن و اطمینان و عافیت رعایا کے لیئے کسی طرح ممکن نہ تھی۔

ملک عنبر نے یہ سارے کام کیئے۔ اور اگرچہ یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ وہ اِن سب میں کامیاب بھی ہوا۔ تاہم جس حد تک کامیابی ہوئی، مورخین اسے بھی خوارق عادات میں شمار کرتے ہیں۔ اور اسی بناء پر علامہ شبلی کی رائے ہے کہ "ملک عنبر کے سیاسی و علمی و اصلاحی کارناموں کی تفصیل کے لیئے ایک مبسوط و ضخیم کتاب بھی کافی نہیں"۔

افسوس ہے کہ ضیق مجال نے اس تفصیل کے لیئے اجمال کی گنجائش بھی باقی نہیں چھوڑی ہے۔ اس لیئے ہم کو اس مضمون میں صرف چند تلمیحات پر کفایت کرنی ہے۔ لیکن یہ بھی وہ باتیں ہیں جن کے تذکرے سے آپ فارسی کی عام تاریخوں کو خاموش پائینگے۔ فکیف اُردو جس میں کوئی جامع تاریخ ہی نہیں ہے

(۸)

ملک عنبر نے اس عہد میں جو جو کام کئے اُن کا خلاصہ یہ ہے :-

(۱) حدود تلنگانہ سے مقام بیڑ کے تین میل مسافت تک احمد نگر کے جنوب میں ۱۲ میل تک۔ دولت آباد سے ساڑھ میل تک کے علاقے محکم کر لئے۔ جن میں حکومت کی آزادی واستقبال کا منازع کوئی نہ تھا۔

(۲) ارکان حکومت پر سیاست صائبہ کا ایسا قانونی دباؤ ڈالا۔ کہ ملک عنبر کے آخر عہد تک کسی کو سرکشی کی جرأت نہ ہو سکی۔

(۳) خانہ جنگیاں قطعاً مستاصل ہو گئیں۔

(۴) شہنشاہ اکبر نے میرزا عبدالرحیم خان خاناں کو مہمات دکن پر مامور کیا تھا۔ جس نے ملک عنبر کی تادیب کے لئے ایک مہم بھیجی۔ کہ تلنگانہ کے علاقے سلطنت مغلیہ میں شامل کر لئے جائیں۔ ۱۰۱۰ھ ہجری میں ملک عنبر نے اس مہم کو ایسی شکست دی کہ مقبوضات اکبر شاہی بھی اُس کے تصرف میں آگئے۔ اور سلطنت دہلی کے متعدد علاقوں پر حکومت احمد نگر کے تھانے بیٹھ گئے خانِ خانان نے دوبارہ فوج بھیجی جس کا سرلشکر اس کا بڑا بیٹا ایرج میرزا تھا۔ ناندیر کے قریب مقابلہ ہوا۔ اور بڑی سخت لڑائی ہوئی۔" فرشتہ لکھتا ہے :-

"یکے۔ یعنی سپاہ خان خانان جہت بلند نامی و دیگرے یعنی
ملک عنبر۔ برائے حفظ ملک از روئے قہر و غضب بتعبیہ سپاہ
متوجہ گردیدند۔ و در غایت شدت و خصومت بر یک دیگر حملہ
آوردہ شرط مردی و مردانگی بجائے آوردند۔ و با گرز و نیزہ

و شمشیر و تیر سر و روئے ہمدیگر شکستہ جداول خون رواں ساختند"

اتفاق سے عین معرکہ میں ملک عنبر کہ فوج کو لڑا بھی رہا تھا اور لڑ بھی رہا تھا۔ زخمی ہو کر گھوڑے سے گر گیا۔ حبشیوں نے اس کی جان بچانی مقدم سمجھی اور میدان جنگ سے اُس کو باہر نکال لے گئے۔ ایسی حالت میں عنبر کو طبعاً شکست ہوئی تھی۔ لیکن اس کا حوصلہ پست نہ ہُوا۔ بلکہ شکست نے آرزوئے فتح اور بھی بڑھا دی۔ اور اب اس نے مغلوں سے آخری فیصلے کی ٹھان لی مغل بھی اس کی جرأت و شجاعت کے معترف تھے۔ اور اس کی بے نظیر قابلیت سپہ سالاری و سرفروشی و جانبازی کا اُنہیں تجربہ بھی ہو چکا تھا۔ مصالحت بہتر سمجھی گئی اور دونوں حریفوں میں صلح ہو گئی۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ:۔

"عنبر باز و رصد و فراہم آوردن لشکر شدہ جہت محافظت ممالک خود از تگاپوے باز نیامد۔ خان خاناں چوں شجاعت و مردانگی او بخاطر آوردہ بُود و می دانست کہ باز در فکر لشکر کشی است۔ ہر آئینہ در مقام صُلح شد۔"

اس مصالحت نے جنگ و جدل کا خاتمہ کر دیا۔ اور اواخر عہدِ اکبر شاہ بلکہ اوائل سلطنت جہانگیر تک کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔ اور مغلوں کی جانب سے ایک مدّت کے لیئے بالکل اطمینان ہو گیا۔

(۵) منافقوں کا ایک گروہ پہلے تو ملک عنبر کا جاں نثار بنا ہُوا تھا مگر مغلوں سے صلح کر لینے کے بعد اس کو ریشہ دوانی کا موقعہ ملا۔ اور علانیہ مخالفت شروع ہو گئی۔ اس گروہ میں فرہاد خاں۔ ملک صندل۔ راؤ پتنگ رائے کولی

وغیرہ متعدد امرائے بارگاہ شامل تھے۔ جو سب کے سب موقع پاکر معہ اپنے خیل وحشم کے ملک عنبر سے باغی ہو گئے۔ ملک عنبر کے لئے یہ نہایت نازک وقت تھا کہ خود اس کے دست بازو اسے چھوڑ چلے تھے۔ با ایں ہمہ عزم بلند میں کوئی فرق نہ آیا۔ اور قلعہ "اُدسہ" کی لڑائی میں اُس نے سب کو شکست دی پتنگ رائے کولی کہ اس جماعت کا سرخیل تھا زندہ اسیر و دستگیر ہؤا۔ اور باقی" مفرور ہو گئے۔

سازش گروں کے حق میں یہ جنگ قضائے مبرم تھی جس نے شورہ انگیزیوں کی بیخ کنی کر دی۔

(۶) ملک عنبر کو اپنی ذاتی حیثیت مضبوط بنانے کے لئے توسیع سلسلہ فتوحات کی ضرورت تھی۔ اواخر ماہ ربیع الآخر ۱۰۱۴ھ ہجری میں اس نے قلعہ پرندہ پر لشکر کشی کی جو تقریباً بیس برس سے منجھن خاں حبشی کے زیر حکومت تھا قلعہ دار نے سفارت بھیجی کہ "نظام شاہ تو جب چاہیں قلعہ پر قابض ہو جائیں مگر ملک عنبر تو مغلوں سے تعلق رکھتا ہے۔ خان خاناں سے مل چکا ہے۔ وہ کس طرح قابلِ اعتماد ہو سکتا ہے"۔

ملک عنبر نے اس سفارت کے جواب میں جو باتیں کیں۔ وہ خود اس کے لفظوں میں یہ تھیں :-

"چوں من از غدر تتنگ رائے و فرہاد خاں و ملک صندل

ایمن نبودم۔ بنا بر صلاح وقت و خان خاناں ملاقات کرد۔

و بجسب ظاہر بہ ایشاں گشتم۔ تا از صمیم قلب من جملہ غلامان

نظام شاہم۔ وے خواہم لوازم دولت خواہی بجا آوردہ در حفظ سلطنت ایں دودمان مساعی جمیلہ بتقدیم رسانم۔"

یہ سفارت بے نتیجہ رہی۔ حملہ آور فوج نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ فرہاد خاں و ملک صندل بھی منجھن خاں سے مل گئے تھے۔ مگر ایک مہینے کی کشش و کوشش کے بعد اپنے آپ کو ملک عنبر کا مرد میدان نہ پا کر قلعہ خالی چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اور بیجاپور پہنچ کر عادل شاہیوں کے دربار میں ملازمت کر لی چند روز کے بعد وہ حسن تدبیر سے قلعہ پر قابض ہو گیا۔ ارد گرد کے علاقے از خود مطیع ہو گئے۔ جن سب کو نظام شاہ کے حوالہ کر کے ملک عنبر احمد نگر چلا گیا۔

نفاق آرائی کا بازار اس واقعہ کے بعد بالکل ہی سرد ہو گیا۔ اور پھر کوئی منافق باقی نہ رہا۔

(۷) ملک عنبر نے حسب ذیل ملکی اصلاحات و انتظامات کئے۔

(ا) حفظ امن کے لئے ہر جگہ پولیس کے تھانے بٹھائے۔ اور ایک خاص جنگی پولیس قائم کی۔ کہ حدود مملکت محفوظ و مضبوط رہیں۔

(ب) فوجدار مقرر کئے۔ کہ پولیس کی نگرانی رکھیں۔ رعایا پر زور و ظلم نہ ہونے دیں۔ افتادہ اراضی آباد کرائیں۔ وسائل آمدنی بڑھائیں۔ ملک کو شورش و تباہی سے بچائیں اور بنیان حکومت کو ہر طرح سے قوی بنائیں۔

(ج) سررشتۂ انتظام اوقاف کی بنیاد ڈالی۔

(د) ایک مستقل وزارت قائم کی۔ جس کے افسر اعلیٰ کا لقب صدر جہاں ہوتا تھا۔ اور جس کا کام یہ تھا۔ کہ مستحقین کے لئے جاگیر وظائف اور معافیوں کا

انتظام کرے۔ تعلیم و تربیت کو ترقی دلائے۔ سیرت انسانی کو نظام معاشرت کے دائرہ سے باہر نہ ہونے دے۔ اور شریف گھرانوں کی محافظت کرے کہ ان میں شریفانہ فضائل کی قومی و خاندانی روایتیں بدستور قائم و مسلسل رہیں۔

(ہ) ابتدائی تعلیم کو عام کرنے کے لئے ہر ایک بستی اور آبادی میں مکاتب کھولے۔

(و) تزکیۂ اخلاق کے لئے خانقاہیں بنوائیں۔

(ز) تعلیم و تربیت مفت رکھی۔ جس کے مصارف کی ذمہ دار رعایا نہ تھی۔ بلکہ خود سلطنت تھی۔

(ح) نہریں جاری کرائیں۔ سررشتۂ آبپاشی کھولا۔ ملک کا نیا بندوبست کیا۔ خراج سرکاری کی حد بندی کردی۔ کہ دس فیصدی سے بڑھنے نہ پائے غیر ضروری ٹیکس معاف کردیئے۔ حکام کے جور و تشدد سے رعیت کو نجات دلائی۔ پل بنوائے۔ مہمان سرائیں بنوائیں۔ جابجا سڑکیں تیار کرائیں حفظِ صحت میں ترقی کی۔ تجارت کو ترقی دینے کے لئے آسانیاں پیدا کیں۔ پیشہ وروں سے محصول معاف کردیئے۔ ڈاک میں اصلاح کی۔ خبر رسانی کے لئے ہرکارے متعین کئے۔ کہ ہر مقام کے حالات سے روزانہ خبر دیتے رہیں اور ان پر نگرانی کرنے والے مامور کئے۔ جن کے باقاعدہ دباؤ سے جھوٹی خبریں نہ دینے پائیں۔

(ط) رعایا کو جنگی تربیت دی۔

(ی) آزادی اقوام کی عزت کی۔

(۹)

ملک راجو دکن کے دربار نظام شاہی کا ایک اعلیٰ رکن تھا جس کے قبضہ میں شمالاً دولت آباد سے حدود گجرات تک اور جنوباً احمد نگر سے اٹھارہ میل مسافت تک کے علاقے تھے اور کامل خود مختاری کے ساتھ وہ اِن علاقوں پر حکومت کرتا تھا۔

یہ شخص ملک عنبر کا حریف تھا۔ اور ہمیشہ سے زک دینے کے درپے رہا کرتا تھا۔ ملک عنبر کے علاقے پر مغلوں کا حملہ بھی اُسی کی تحریک سے ہوا تھا۔ اور امرائے عنبر کو بغاوت پر بھی اسی نے آمادہ کیا تھا۔

سنہ ۱۰۱۴ ہجری میں ملک راجو نے بذات خاص حملہ کر کے ملک عنبر کے مقبوضات مسخر کر لینے چاہے۔ لیکن خان خانان کی کمک سے وہ اس ارادہ میں ناکام رہا۔

اسی سال کے آخری ایام میں ملک عنبر نے دولت آباد پر فوج کشی کی کہ ملک راجو کا استیصال کر دے۔ لیکن اس مرتبہ خان خانان کی فوجیں بین العسکرین حائل ہو گئیں۔ اور چھ مہینے تک حائل رہیں کہ ایک کو دوسرے پر حملہ کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔

سنہ ۱۰۱٦ ہجری میں ملک عنبر کی آخری چڑھائی نے ملک راجو کا خاتمہ کر دیا۔ اور اس کے مقبوضات بھی ملک عنبر کی قلمرو میں شامل ہو گئے۔

ملک عنبر کے استقلال کا یہ عہد شباب تھا۔ سارے دکن میں اُس کے جاہ و جلال کا سکہ چلنے لگا۔ اور پھر کسی دکنی حکومت کو اس سے منحرف ہونے

کی جرأت نہ ہوسکی۔ لیکن یہ ایک سب سے بڑا معرکہ پیش آنے والا تھا جس کے انفصال پر اس امر کا انفصال بھی ہوتا تھا کہ یا تو ملک عنبر کی حکومت کا نام و نشان بھی نہ رہیگا اور یا اُس کی سطوت و جبروت میں ایسی ترقی ہوگی کہ پھر کسی بڑے سے بڑے حریف میں بھی تاب مقاومت باقی نہ رہیگی۔

(۱۵)

ملک عنبر ابتداء میں دربار بیجاپور کا ایک عہدہ دار رہا تھا۔ اور غلامانہ زندگی سے ترقی کرتے آزادانہ حکومت کی طرح ڈالی تھی۔ فرماں روائے بیجاپور (ابراہیم عادل شاہ) کو اس کی اولوالعزمی گوارا نہ تھی۔

بارہا ملک عنبر کو قتل کر ڈالنے کی سازشیں ہوئیں زہر دینے کی سازشیں ہوئیں۔ قید کر لینے کی سازشیں ہوئیں۔ مگر سب میں ناکامی ہی ناکامی پیش آتی رہی۔ آخری وار یہ تھا کہ دربار بیجاپور خود تو ملک عنبر کے استیصال پر قادر نہ تھا شہنشاہ جہانگیر شہریار دہلی سے استدعا کی کہ افواج شاہی اگر اس کی تادیب کے لیے حرکت میں آئیں تو ابراہیم عادل شاہ فی منزل ایک لاکھ ہون کے حساب سے نذرانہ دیگا (ہون سونے کا ایک سکہ تھا جس کے مختلف اوزان تھے سب سے کم وزن کا ہون ساڑھے سات روپے آٹھ آنے کا ہوتا تھا۔ معلوم نہیں یہ ہون کس وزن و قیمت کا تھا)۔

جہانگیر خود بھی تسخیر دکن کی فکر میں تھا۔ اس تحریک کے ہوتے ہی ایک عظیم الشان لشکر بھیج دیا۔ کہ ملک کو مسخر اور عنبر کو مقید کرے۔ دوسری جانب سے ابراہیم عادل شاہ بھی آیا۔ اور ان دونوں افواج نے چاروں طرف ملک عنبر

کو محصور کرلیا۔
واقعات ملک عنبر کے بالکل مخالف تھے۔ اور بظاہر اسباب اُس کی ہلاکت میں کوئی شائبہ باقی نہیں رہا تھا۔
مقابلہ ہُوا اور نہایت شدید مقابلہ ہُوا۔ عساکر دہلی و افواج بیجاپور دونوں کو ہزیمت ہوئی۔ اور ملک عنبر نے غنیم کے چالیس سے زیادہ افسران دستی گرفتار کر لیئے۔ یہ فتح عظیم سب سے بڑی طراز آرائے اقبال تھی۔ لیکن اب آفتاب اقبال اس حد کمال کو پہنچ چکا تھا جس سے آگے صرف میر انیس کا وہ مشاہدہ زوال باقی رہ گیا تھا کہ ؎

عروج مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا

(۱۱)

ملک عنبر نے سلطنت ہندوستان کو شکست دی۔ حکومت بیجاپور کو شکست دی۔ لیکن فرشتۂ موت کو وہ بھی شکست نہ دے سکا۔ ۱۰۳۵ھ میں انتقال کر گیا۔ اور بجز نام نیک کے اور کوئی یادگار باقی نہ چھوڑی مادہ تاریخ وفات "جعل الجنۃ مثواہ" ہے دکن میں اس کے مزار کی بڑی عزت کی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ اس حرم عافیت میں اگر کوئی مجرم بھی پناہ گیر ہوتا۔ تو جب تک وہاں رہتا۔ قانون اُس سے متعرض نہ ہو سکتا۔
ملک عنبر کا بڑا بیٹا عبدالعزیز اس کا جانشین ہوا۔ فتح خاں اُس کو خطاب ملا اور وزیر اعظم کا منصب عنایت ہُوا۔ یہ شخص شجاع بھی تھا۔ بلند ہمت بھی تھا۔ فیاض بھی تھا۔ صاحب علم بھی تھا۔ لیکن عاقبت اندیش نہ تھا۔ استبداد

پسند تھا۔ عام رائے کی نہ کبھی عزت کی۔ نہ غرور نے اصفائے مشورہ کی اجازت دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارا جاہ و جلال۔ ساری شان و شوکت خاک میں مل گئی مرنے کے بعد کوئی ایسا بھی نہ رہا کہ اس کا نام لے یا اُس پر دو آنسو بہائے:

یہ بھی مرنا عجیب مرنا ہے ۔۔۔ مر گئے ساتھ ساتھ جس کے صفات
ایسے جینے پہ مرتے ہیں افسوس ۔۔۔ ایسے مرنے پہ جیتے ہیں ہیہات
سچ کہا ہے نبیٔ برحق نے ۔۔۔ اکثروا ذکر ھادم اللذات

(۱۷)

اس قدر واقعات بیان کرنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ملک عنبر کے اُن مخصوص روشن کارناموں کی تشریح کر دی جائے۔ جو صرف مورخینِ عرب نے قلمبند کئے ہیں۔ علامہ محبی فرماتے ہیں:۔

(الف) انفقت له وقائع کثیرة و فتح قلاعاً ونفذت کلمته واتسعت مملکته واخرب الکنائس وعمر شعائر الاسلام

(الف) ملک عنبر کو بہت سے واقعات پیش آئے اُس نے قلعے مسخر کئے نافذ الکلمہ ہو گیا مملکت میں وسعت آ گئی۔ جو معبد ویران کر ڈالے اور شعائر اسلام آباد کئے۔

(ب) ازال المظالم وعمرها و اخمد الفتنة والبدعة وعمر المساجد والمآثر وکان مؤیداً فی زدبه ومنازیه مسدداً فی ارایه مسعوداً فی احواله۔

(ب) ان اطراف سے مظالم کی بیخ کنی کر دی ملک کو آباد کیا شورش و فساد و بدعت کی گرم بازاری سرد ہو گئی۔ مسجدیں آباد کیں فضائل جنہ راج یتہ لڑائیوں میں کامیاب۔ ناصائب الرائے تھا اور اس کے حالات زندگی پر سعادت غالب تھی۔

(ج) كان كثير الاحسان الى السادة واهل العلم وقصدة الناس من جميع البلدان فغمرهم باحسانه وخصوصاً اهل تريم من السادات۔ وكان يحسن المشائخ الطريق والصوفية۔ وكان عصره احسن الاعصار وزمانه النضر الازمنه۔

(ج) سادات واہل علم کی بڑی قدر کرتا تھا۔ ہر ملک کے لوگ اُس کے دربار میں آئے۔ جو اس کے دریائے جود و کرم میں غرق ہوگئے۔ خصوصاً سادات تریم (یمن) کی بڑی بزرگداشت کی مشائخ طریقت و صوفیہ کرام کیساتھ بڑا احسان کرتا تھا اس کا زمانہ بڑا بہترین زمانہ اور اس کا عہد حکومت بڑی خوشحالی کا عہد تھا۔

(د) كان يحمل كل سنة الى حضر موت من الاموال والكسوات للسادة والمشائخ والفقراء ما يقوم بهم سنة

(د) حضرموت میں سادات و مشائخ و فقراء کے لئے ہر سال عطیات و ملبوسات بھیجا کرتا تھا۔ جو سال بھر تک کے لئے انہیں کافی ہوا کرتے تھے۔

(ہ) وله كان له ديوان مرتب باسماء ارباب الرسوم والقصاد

(ہ) اس کے ہاں ایک خاص دفتر تھا جس میں اُن تمام لوگوں کے نام درج تھے جو اسکے وظیفہ خوار تھے یا مالی اغراض سے اسکے دربار کا قصد کیا کرتے تھے

(و) وقف اربعة قرآن مدينة تريم ووقف بمكة والمدينة مصحفين واشترى في الحرمين دوراً ووقفها على من يقرأ فيهما ويهدي ثواب القراءة اليه۔

(و) قرآن کریم کی چار جلدیں شہر تریم میں ایک ایک جلد مکہ و مدینہ شریفہ میں وقف کی تھی حرمین محترمین میں مکانیں خرید کر وقف کردی تھیں کہ لوگ یہاں قرآن خوانی کریں اور تلاوت کا ثواب اسکو بخشیں۔

(۱۴۷)

دکن میں سلسلۂ آب پاشی کی توسیع کے لئے ملک عنبر نے ایک نہر (کرکی) براہی مہندسانہ قابلیت آزمائی تھی۔ جو اُس کی بہترین یادگار ہے۔ اس کا واقعہ بھی عجیب ہے۔ جسے تاریخ نے یُوں لکھا ہے:-

من آثاره الحسنة انه نهر الكركی
وهو نهر عظيم يمر تحت البلاد و
لا ننفع به - وسبب ذالك ان بعض
وزراء عادل شاه وهو المولى محمد
الخراسانی - استبعد وقوع ذالك
السعته وكثرة مائه وظن انه
يحتاج الى عمل كثير لا يقدر عليه
احد من المخلوقات وعزم مالاً
كثيراً للملك عنبر ان قدر على
ذالك فشرع فيه وما عدا القدر
فكمل العمل فی خمسة اشهر وجعل
له قنوات تجری الى البساتين و
الزراعات وكثر به النفع وجمع
من فی ذالك المكان من السادة
والاعيان والخدم عليهم

ملک عنبر کے آثار حسنہ میں ایک نہر کرکی ہے
جسے اُس نے بند کرا دیا کہ لوگ اس کے پانی
سے فائدہ نہ اُٹھا سکیں۔ یہ ایک بڑی بھاری نہر ہے
جو متعدد شہروں کے نیچے بہتی ہے مگر اس سے انتفاع
ممکن نہیں۔ سبب یہ ہے کہ دربار عادل شاہ کے
ایک وزیر (ملا محمد خراسانی) ایسا ہونا بعید الوقوع
جانتے تھے۔ کیونکہ یہ بڑی گہری وسیع لمبی چوڑی
تھی اور اس میں پانی بہت تھا ملا محمد خراسانی کو
گمان تھا کہ یہ اتنا بڑا کام ہے کہ مخلوقات میں کوئی
بھی اسے انجام نہیں دے سکتا۔ ملائے مذکور نے شرط
باندھی تھی کہ ملک عنبر ایسا کر سکے تو انہیں بہت سا روپیہ
تاوان دینگے۔ ملک عنبر نے یہ کام شروع کر دیا۔ تقدیر
نے مدد دی اور پانچ ہی ماہ میں کام پورا ہو گیا۔ اس
نہر میں سے ملک عنبر نے چھوٹی چھوٹی نہریں
نکلوائیں جو باغوں اور زراعتوں کو سیراب کرتی

واجزل الصدقات وكافت ماته فی سنة اربع وعشرین والف واخترع الفضلا الذلك تواریخ عدیدة بکل لسان و من الطف ما قیل فیه "خیر جاری"۔

تھیں اور جن سے بڑے بڑے منافع حاصل ہوئے تکمیل عمل کے بعد بہت سے سادات و شرفاء کو جمع کر کے انعامات دیئے اور بڑی خیرات کی یہ واقعہ تعمیر ۱۰۲۴ھ کا ہے ارباب فضیلت نے ہر ایک زبان میں اس کی تاریخیں نکالی ہیں جن میں لطیف ترین مادۂ تاریخ "خیر جاری" ہے ؛

یہ واقعہ ایک تو ملک عنبر کے فاضلانہ علمی کمالات پر روشنی ڈالتا ہے۔ کہ علم ہندسہ میں وہ کیا کچھ کمال رکھتا تھا۔ دوسری بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ دربار عادل شاہی اگرچہ اُس کا سخت دشمن تھا۔ مگر اہل دربار میں ایسے لوگ بھی تھے جو اس کے ساتھ راہ و رسم رکھتے تھے۔ جس کے باعث تلاش کرتے ہوں تو ملک عنبر کے فضائل و معارف اور اس کے ساتھ راہ و رسم رکھنے والوں کے ذوق علمی کی ضمن میں تلاش ہو سکتے ہیں۔ اور دستیاب بھی وہیں سے ہوں گے۔

(۱۴)

عربی تاریخ میں ملک عنبر کے واقعات زندگی میں ایک بات پر بڑا زور دیتے ہیں کہ قصدہ جماعة عن مشاهیر شعراء عصرہ من البلاد الشاسعه و مدحوہ باحسن المدائح۔ مشاہیر شعرائے زمانہ کی ایک جماعت نے دور دور کے ملکوں سے اُس کے دربار میں آ آ کر خوب خوب مدحیہ قصیدے اُس کی شان میں کہے۔

یہ وہ بات ہے۔ جس پر آج کل یا تو اچٹتی نگاہیں پڑیں گی یا اس کو

بادہ خوانی اور بادہ فروشی کا ایک لغو فعل کہا جائیگا۔ کہ مداحی و مبالغہ آرائی قوم کے حق میں ہمیشہ بدترین تاثیر بد مذاقی کا موجب ہوا کی ہے۔

ہم کو اس فلسفہ پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم صرف اس قدر بتانا چاہتے ہیں کہ ملک عنبر کی زبان عربی تھی۔ اس نے عرب میں تربیت پائی تھی۔ اُس کے مداح عام شعرائے عرب تھے۔ جو عراق و مصر و شام و افریقہ تک سے ہندوستان آتے تھے۔ اور اس کے خوانِ کرم سے فیضیاب ہو کر واپس جاتے تھے۔

دکن میں عربیت کی بنیاد اسی علمی چرچے نے استوار کی اور ہندوستان اس مائدہ ادب عرب سے ذوق گیر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

عربی لٹریچر سے جن لوگوں کو دلچسپی ہے وہ اعتراف کرینگے کہ اُس باب میں بھی ہندوستان ملک عنبر کا رہین احسان ہے۔

———— (٭) ————
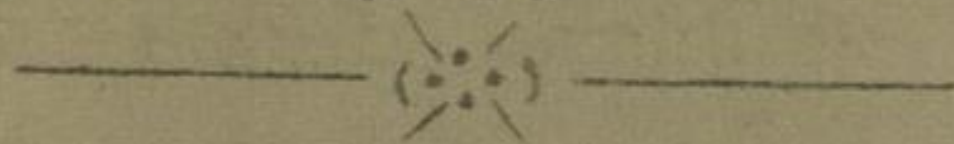
المقنّع

میرزا غالب کا ایک شعر ہے کہ:۔

چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے
خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

میرزائے مرحوم فرماتے ہیں کہ دستِ قدرت سورج کو بنا رہا تھا۔ ابھی وہ لمعانی و درخشانی میں میرے معشوق کے برابر نہ ہوا تھا کہ اسے "ماہِ نخشب" کی طرح چھوڑ دیا گیا۔ اس شعر کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ "ماہِ نخشب" ایک نامکمل یا برائے نام چاند تھا لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ "ماہِ نخشب" کیا تھا؟ اس کا موجد کون تھا اور اس عجیب و غریب چیز کی اصلیت و ماہیت کیا تھی؟ ان سوالوں کا مدلّل و مستند جواب مولٰنا ظفر علی خاں کے مندرجہ ذیل مضمون سے حاصل کیجئے۔ (مرتب)

دُنیائے اسلام میں وقتاً فوقتاً کچھ سر پھرے لوگ ایسے پیدا ہوتے رہے ہیں جنہوں نے رسالت بلکہ خدائی تک کے دعوے سے جہلا و حمقا کی ایک جماعت کو اپنا

حلقہ بگوش بنا کر کچھ دیر کے لئے اپنا اُلّو سیدھا کر لیا ہے۔ المقنع کا شمار بھی اسی شورید سر جماعت میں ہے۔ مہدیٔ عباسی کے عہد خلافت میں ۱۶۰ھ کے قریب اس شخص نے خراسان میں خدا ہونے کا دعویٰ کیا۔ اور چونکہ خدا اپنے بندوں کا مطیع ہو کر نہیں رہ سکتا۔ اس لئے المقنع کے دعوے نے بہت جلد سیاست کی شکل پکڑ لی یہاں تک کہ خلافت کو اس کی سرکوبی کے لئے ایک فوج جرار بھیجنی پڑی جب مقابلہ کرتے کرتے وہ عاجز آگیا اور کوئی صورت مفر کی اُسے نظر نہ آئی تو آگ میں جل کر مر گیا۔ کہ الوہیت اور نبوت کے ایسے مدعیوں کا ایسا ہی انجام ہونا چاہئے۔ اسے المقنع کیوں کہتے تھے۔ اور اس کی شکل صورت کیسی تھی؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا جواب ہم ابوریحان بیرونی۔ ابن خلکان۔ ابن اثیر اور قزوینی کی زبانی دینگے۔ کہ ان مصنفین میں سے ہر ایک نے اس بارے میں کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔

اقتباس از بیرونی "اس زمانہ میں ہاشم بن حکیم جو المقنع کے نام سے مشہور ہے مرو کے ایک گاؤں کواکی مردان میں ظاہر ہوا۔ چونکہ وہ کانا تھا۔ اس لئے اپنے عیب یک چشمی کو چھپانے کیلئے منہ پر سبز ریشم کا نقاب ڈالے رہتا تھا۔ اُس کا دعویٰ تھا کہ خدا ممثل و مجسم ہو کر میری شکل میں ظاہر ہوا ہے کہ انسان کو خدا صرف اسی طرح نظر آسکتا ہے۔ دریائے جیحوں کے پار اتر کر اس نے اضلاع کش و نسف کا رُخ کیا اور خاقان چین کیساتھ نامہ و پیام کر کے حکومت وقت کے خلاف اُس سے طالب امداد ہوا۔ اس عرصہ میں فرقۂ مبیضہ اور ترکوں کی ایک جماعت کثیر اُس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئی تھی اور وہ علم بغاوت بلند کر چکا تھا۔ جو کوئی اُس کا مقابلہ کرتا تھا۔ اُسے وہ

بیدریغ قتل کر ڈالتا تھا۔ اور اپنے حریفوں کے مال ومتاع اور عورتوں کو اپنی جماعت میں تقسیم کر دیتا تھا۔ خلیفہ مہدی عباسی کی جو فوجیں شروع شروع میں اس فتنہ کو مٹانے آئیں۔ ان سب کو اس نے شکست دی۔ اور چودہ سال تک وہ اس علاقہ میں کامل خود مختاری کے ساتھ حکومت کرتا رہا۔ لیکن بالآخر اپنے قلعہ میں گھر گیا۔ اور ۱۶۹ھ میں مارا گیا۔ جب چاروں طرف سے فتنوں قاہرۂ خلافت نے اُس کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ اور اُسے کوئی صورت بچنے کی نظر نہ آئی تو وہ آگ کے ایک دہکتے ہوئے الاؤ میں کود پڑا تاکہ اُس کا جسم جل کر خاک سیاہ ہو جائے۔ اور اُس کا کوئی نشان باقی نہ پا کر اُس کی جماعت اُس کے دعویٔ الوہیت کو آخر وقت تک صحیح سمجھتی رہے۔ لیکن اُس کی یہ آرزو پوری نہ ہونے پائی۔ جب اسلامی لشکر قلعہ کے اندر داخل ہؤا تو اُس کی جھلسی ہوئی لاش بھٹی کے اندر پڑی ہوئی پائی گئی۔ چنانچہ اُس کا سر کاٹ کر خلیفہ مہدی کے پاس بمقام حلب بھیج دیا گیا۔ ماورالنہر میں ابھی تک ایک فرقہ ایسا موجود ہے جو اگرچہ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتا ہے لیکن دربردہ اُس کے مذہب کا پیرو ہے المقنع کے سوانح زندگی کا بیں نے فارسی سے عربی میں ترجمہ کیا ہے۔ اور اپنی کتاب "تاریخ فرقۂ مبیضہ و فرقۂ قرامطہ" میں اس موضوع پر شرح وبسط کے ساتھ بحث کی ہے"۔

فرقۂ مبیضہ و فرقۂ قرامطہ کی جس تاریخ کا علامہ ابوریحان بیرونی نے حوالہ دیا ہے افسوس ہے کہ دستبرد روزگار سے وہ تلف ہوگئی ہے۔ اور اُس کا ایک نسخہ بھی اس وقت دنیا میں موجود نہیں۔ علامۂ ممدوح کی ایک اور کتاب "قانون مسعودی" کے ساتھ بھی انقلاب روزگار شاید یہی سلوک کرتا۔ لیکن سر سید احمد خاں مرحوم و

مغفور کا ذوق علمی اس بدیع المنزلت تصنیف کا ایک نسخہ زمانہ کی علمی لوٹ سے
بچا کر علی گڑھ میں لے آیا تھا۔ مسلمانوں کی بدمذاقی کا یہ عالم ہے کہ مدتوں یہ نسخہ مدرستہ العلوم
کی الماریوں میں مقفل پڑا رہا۔ اور کسی کو اس کی ورق گردانی کی بھی توفیق نہ ہوئی۔ آخر
ایک نامسلمان مغربی نقاد نے اس گوہر بے بہا کو دُرج گمنامی میں سے نکالا۔ اور
ہمارے معلموں کو خدا خدا کر کے اس کی اشاعت کا خیال پیدا ہوا۔ لیکن کئی سال
سے وہ اس فکر میں ہیں کہ اس کا انگریزی ترجمہ شائع کیا جائے۔ مسلمانوں میں کوئی
پروفیسر سجاد تو ہمیں نظر نہیں آتا۔ جس کی مساعی جمیلہ سے یہ بیل منڈھے
چڑھے سردست اگر کارفرمایان علی گڑھ اصل عربی نسخہ ہی کو شائع کر دیں تو علم پر
بہت بڑا احسان ہوگا۔ عربی سے اردو میں ترجمہ کرنیوالے کئی خدا کے بندے نکل آئینگے۔
اور ابوریحان بیرونی کی یہ نادر المثال یادگار زندہ جاوید ہو جائیگی۔[۱]

اقتباس از ابن خلکان } "المقنع الخراسانی جس کا اصلی نام عطا ہے
لیکن جس کے باپ کا نام مجھے معلوم نہیں
اگرچہ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ اُس کے باپ کا نام حکیم تھا مرو میں رفوگری کا پیشہ
کیا کرتا تھا۔ سحر و نیرنجات میں تھوڑی بہت مہارت پیدا کرنے کے بعد اس نے دعویٰ
کیا کہ میں خدا کا مظہر مثالی یعنی اوتار ہوں جو مجھ میں حلول کر کے ظاہر ہوا ہے۔ اپنے
پیرؤں سے وہ کہا کرتا تھا کہ خدائے جل و علا نے پہلے آدم کا روپ دھارا۔ اور
اسی لئے اُس نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے سجدہ کریں۔ (فسجدوا الا
ابلیس ابیٰ واستکبر) چنانچہ اُنہوں نے سجدہ کیا۔ البتہ ابلیس نے ازراہ تجبر سجدہ
کرنے سے انکار کیا۔ اور خدا کے قہر و غضب کا بجا طور پر مورد ہوا۔ آدم کے بعد خدا

---

[۱] مولینا نے اس خیال کا اظہار ۱۹۱۷ء میں کیا تھا۔ (مرتب)

نے نوحؑ کے جسم میں حلول کیا۔ اور نوح کے جسم سے نکل کر مختلف انبیاء و حکماء کو
اپنی تجلیات کا مظہر بناتے ہوئے ابو مسلم خراسانی کی شکل میں ظاہر ہؤا جس کے بعد
اُس کی قدرت کاملہ و حکمت بالغہ کا ظہور مجھ میں ہؤا ہے۔ باوجودیکہ عقلِ سلیم ان
تمام باتوں کی نفی کر رہی تھی۔ اور اُس کی وضع و قطع میں بھی جناب باری کی کوئی شان
جمالی جھلکتی ہوئی نظر نہ آتی تھی۔ اس لئے کہ وہ کریہہ المنظر یک چشم اور پست قامت
تھا۔ اور ساتھ ہی ہکلانا بھی تھا۔ اور اپنی زشت روئی کو چھپانے کیلئے ہمیشہ
چہرہ پر ایک طلائی نقاب ڈالے رہتا تھا۔ اور اسی لئے اُسے المقنع یعنی نقاب پوش
کہتے تھے۔ پھر بھی بہت سے سادہ لوحوں پر اُس کے دعاوی کا جادو چل گیا۔
جنہوں نے اُس کی پرستش شروع کر دی۔ اور اُس کی حمایت میں مرنے مارنے
کے لئے طیار ہو گئے۔ المقنع نے اپنے معتقدین کے دلوں پر جو قابو پا لیا تھا۔
اُس کا باعث کچھ ساحرانہ شعبدے تھے جن کی نظر فریبیاں جُہلا پر اپنا اثر ڈالے
بغیر نہ رہ سکتی تھیں۔ ان شعبدوں میں سے ایک یہ تھا کہ اُس نے ایک نقلی چاند
بنا کر لوگوں کو دکھا دیا تھا جس کی روشنی دو مہینے کی مسافت پر نظر آتی تھی۔[1]
اِس طلسمی چاند نے اُس کے معتقدین کے حلقہ کو نہایت وسیع کر دیا۔

"جب المقنع کی شہرت دُور دُور پھیل گئی۔ اور اس کے فتنہ سے
اسلام میں خلل پیدا ہونے لگا۔ تو مسلمان اُس کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے
اور اُس پر حملہ کر کے اُس کے قلعہ کو جس میں اُس نے پناہ لی تھی گھیر لیا۔ موت کو
سر پر منڈلاتے دیکھ کر اُس نے پہلے تو اپنی عورتوں کو جمع کر کے انہیں زہر کا ایک
ایک پیالہ پینے کو دیا جسے پی کر وہ ٹھنڈی ہو گئیں۔ اور پھر خود بھی ایک پیالہ اسی

---

[1] یہ "چاند" چونکہ قصبہ نخشب کے ایک کوئیں سے طلوع کرتا تھا۔ اِسلئے اسے "ماہِ نخشب" کہتے ہیں (مرتب)

سم قاتل کا چڑھا کر واصل جہنم ہؤا۔ مسلمانوں نے قلعہ میں داخل ہو کر اُس کے تمام ہمراہیوں کو قتل کر دیا۔ یہ واقعہ ۱۶۳ھ میں پیش آیا۔

"مجھے یہ نہ معلوم تھا۔ کہ المقنع کا قلعہ کس مقام پر واقع ہے اور اُس کا کیا نام ہے۔ آخر یاقوت حموی کی تصنیف "کتاب الشبہات" میری نظر سے گزری۔ جس میں ایک نام کے متعدد مقامات کی تشریح کیگئی ہے۔ اس کتاب کی اُس فصل میں جس کا موضوع سنام ہے۔ یاقوت لکھتا ہے کہ اس نام کے چار مقام ہیں چوتھا قلعہ سنام ہے جو المقنع خارجی نے ماوراء النہر میں تعمیر کیا تھا۔ تاریخ خراسان سے بھی یاقوت حموی کے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب"۔

اقتباس از ابن اثیر "المقنع کا نام حکیم تھا۔ اس کی یہ تعلیم کہ وہ خدا کا مظہر مثالی ہے۔ اُس کے معتقدین کی ایک منتخب جماعت کے لئے مخصوص تھی۔ جس پر اُس نے ظاہر کیا تھا کہ ابو مسلم خراسانی سے الوہیت منتقل ہو کر بطریق حلول ہاشم میں چلی آئی ہے۔ ہاشم سے اُس کی مراد خود اپنی ذات سے تھی۔ چنانچہ اُس کی جماعت میدان جنگ میں یا ہاشم اعنا (اے ہاشم ہماری مدد کر) کا نعرہ لگاتی تھی۔ سعد اور بخارا کا فرقہ مبیضہ اور مشرکین اتراک کا ایک گروہ اُس کا شریک حال ہو گیا تھا۔ اُس کا عقیدہ تھا کہ ابو مسلم خراسانی کا مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اونچا ہے۔ جب اسلامی سپہ سالار سعید الحرشی نے اُس کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا تو امان کے وعدہ پر اُس کے تیس ہزار ساتھیوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ صرف دو ہزار شخص ایسے تھے جنہوں نے آخر وقت تک اُس کا ساتھ دیا۔ یہ دیکھ کر کہ اب موت سے چھٹکارا نہیں

ہو سکتا۔ اُس نے اپنے اہل وعیال کو جمع کیا اور زہر پلا کر اُن کا کام تمام کر دیا۔ پھر حکم دیا کہ اُس کو جلتی آگ میں جھونک دیا جائے۔ تاکہ اُس کے دشمن اُس کے جسم پر قابو نہ پا سکیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ پہلے اُس نے قلعہ کے تمام سامان اور مال ومتاع کو جس میں چوپائے تک شامل تھے جلا کر خاک سیاہ کر دیا اور پھر کہا کہ جس کو میرے ہمراہ بہشت میں جانا ہو وہ میری طرح اس بھڑکتی آگ میں کود پڑے۔ غرض وہ اپنے کنبہ اور اپنے خاص خاص رفیقوں کیساتھ جل کر راکھ ہو گیا۔ اور جب فوج قلعہ میں داخل ہوئی۔ تو ایک بھی متنفس موجود نہ تھا۔ اس واقعہ نے المقنع کے مریدوں کی بقیتہ السیف جماعت کا عقیدہ اور بھی مضبوط کر دیا۔ اس جماعت کا ایک گروہ مبیّضہ ہے جو ماوراء النہر میں بستا ہے۔ اور اپنے عقیدہ کو مخفی رکھتا ہے۔ مبیّضہ انہیں اس لئے کہتے ہیں کہ وہ سفید لباس پہنتے ہیں۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ المقنع آگ میں جل کر نہیں بلکہ زہر پی کر مر گیا۔ اور الحرشی نے اس کا سر کاٹ کر خلیفہ مہدی کے پاس بھیج دیا۔ جو اُس وقت (سنہ ۱۶۳ھ) ایک فوجی مہم پر حلب گیا ہوا تھا۔

اقتباس از قزوینی } علامہ قزوینی آثار البلاد میں نخشب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"نخشب خراسان کا ایک مشہور شہر ہے۔ جس کی خاک سے متعدد اولیاء وحکماء اُٹھے ہیں۔ حکیم المقنع کا تعلق بھی اسی شہر سے ہے۔ اُس نے یہاں ایک کنواں بنایا تھا۔ جس میں سے ایک چاند نکلتا تھا۔ اور لوگوں کو اصلی چاند کی طرح نظر آتا تھا۔ ماہ نخشب کی شہرت اطراف واکناف عالم میں پھیل گئی۔

اور لوگ دور دور سے اس اعجوبہ کو دیکھنے کے لئے نخشب آنے لگے۔ لوگ اس کو جادو کا چاند سمجھتے تھے۔ لیکن در اصل یہ علم مناظر و مرایا کا ایک کرشمہ تھا کہ المقنع کو اس میں پوری مہارت حاصل تھی۔ چنانچہ جب کوئیں کی تہ میں اُتر کر دیکھا گیا۔ تو ایک بہت بڑا طشت پارہ سے بھرا ہوا نظر آیا۔ جس پر چاند کی شعاعیں پڑتی تھیں اور انعکاس و انعطاف ضیائے قمر سے پردہ نگاہ پر ایک خاص حکمت سے چاند کی تصویر اُتر آتی تھی۔ بہر حال المقنع نے حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔ اور اُس کی شہرت ایسی پھیلی۔ کہ اس کا نام ضرب المثل ہو کر اشعار میں داخل ہو گیا۔"

ان اقتباسات میں ناظرین نے بعض جزئی اختلافات ملاحظہ فرمائے ہونگے بیرونی نے المقنع کا نام ہاشم ظاہر کیا ہے۔ ابن خلکان کہتا ہے کہ اس کا نام عطا تھا۔ ابن اثیر کے بیان کے بموجب اُس کا نام حکیم ہے کنیت میں بھی اختلاف ہے۔ اُس کا سال وفات بھی مختلف ہے۔ ابن خلکان اور ابن اثیر نے ۱۶۳ھ لکھا ہے۔ بیرونی ۱۶۹ھ لکھتا ہے۔ یہ مسئلہ بھی مختلف فیہ ہے۔ کہ وہ اپنے قلعہ میں محصور ہو کر زہر سے مرا یا آگ میں جل کر۔ لیکن یہ خفیف جزئیات ہیں۔ جن سے اُس کی شخصیت اور اُس کی زندگی کے نمایاں واقعات کی تاریخی حیثیت پر اثر نہیں پڑتا۔ ان جزئیات سے ہمیں کوئی بحث نہیں۔

ہمارے پیش نظر المقنع کی صرف دو بڑی حیثیتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اُس نے جناب باری کے بروز ہونے کا دعویٰ کیا۔ اور ایک جماعت اپنے پجاریوں کی پیدا کر لی۔ دوسرے یہ کہ ماہ نخشب کے صانع ہونے کے لحاظ سے وہ ایک بہت بڑا حکیم تھا۔ پہلی حیثیت پر مزید خامہ فرسائی کرنا ایک فعل عبث ہے۔

مسیلمہ کذاب کے وقت سے لیکر آج کے دن تک بیسیوں خبطی ایسے پیدا ہوئے ہیں اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے جن میں سے کسی کے سر میں خدا کے رسول بننے کا سودا سمایا ہے۔ اور کوئی اس منصب کو بھی اپنے درجہ سے گرا ہوا سمجھ کر الوہیت کی مسند پر جا بیٹھا ہے۔ اس لئے یہ کوئی نئی بات نہیں لیکن آج سے تقریباً بارہ سو سال پہلے خراسان میں ایک شخص کا علم مناظر و مرایا اور اصول انعکاس و انعطاف ضیا سے اس حد تک واقف ہونا کہ وہ اس کی بنا پر ایک عجیب و غریب ایجاد کر سکے۔ عام اس سے کہ اس ایجاد کا کوئی سود مند یا تجارتی پہلو ہو یا نہ ہو ایک ایسا واقعہ ہے۔ جسے شیدائیان علوم و فنون نظر انداز نہیں کر سکتے ؛

(امریکی ادیب "ایڈگر ایلن پو" کے ایک مضمون کا ترجمہ)
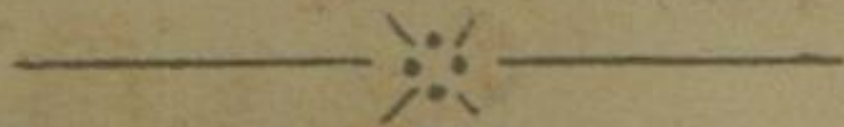
الہام کے ذریعہ سے مسمریزم
اضغاث احلام کی مغربی متصوفانہ شکل

(۱)

مسمریزم کی بنیاد عقل پر ہو یا نہ ہو۔ اس کے کرشموں کی کوئی فلسفیانہ توجیہ کی جا سکے یا نہ کی جا سکے۔ لیکن شک لانے والوں کو یہ بات تو خواہی نخواہی ماننی پڑے گی۔ کہ مسمریزم ایک حقیقت نفس الامری ہے۔ اور اس کے مظاہر سے انکار کرنا بداہت کا منکر ہونا ہے۔

اس دُنیا میں ایک انوکھی جماعت ایسے لوگوں کی بھی ہے۔ جو ہر بات کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کا پوچھنا ہی کیا۔ یہ تو حواس خمسہ کی شہادت کو بھی فریب نظر سمجھینگے۔ آفتاب کی روشنی تک کو بہ نگاہ ارتیاب دیکھینگے۔ نیل کی موجوں پر بھی انہیں سراب کا دھوکا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ شک ایک مرض ہے۔ جو انہیں گھن کی طرح لگا ہُوا ہے۔ اور ان کے دل و دماغ اور اعضاء و جوارح کو دیمک کی طرح چاٹتا چلا جارہا ہے۔ کوئی بات کیسی بھی ابدہ البدیہیات ہو۔ ان کے سامنے بیان کیجئے لیکن بدقسمتی سے اُس کا کوئی منطقی ثبوت پیش نہ کیا جا سکتا ہو۔ تو جھٹ کہدینگے۔ کہ ہم نہ

مانیں گے۔ ایسے سوفسطائی متشککین کے مُنہ لگنا مُفت میں اپنا وقت
ضائع کرنا ہے۔

آج کل کی علمی دُنیا کا یہ ایک پُر اسرار مگر مانا ہؤا واقعہ ہے۔ کہ انسان
محض اپنی قوتِ ارادی سے اپنے کسی ہم جنس کو اس درجہ متاثر کرسکتا ہے کہ
اُس کی حالت عنصری و ذہنی میں ایک غیر معمولی اور فوق الادراک تبدیلی واقع
ہو جاتی ہے۔ اور دیکھنے والوں کو یہ گمان ہونے لگتا ہے۔ کہ حالت تبدیل
شدہ قریب قریب موت کے مُشابہ ہے۔ اس عالم میں وہ شخص جس پر اثر ڈالا گیا ہے
اگرچہ اپنے حواس خمسہ خارجہ سے تو بہت ہی خفیف اور بہت ہی ضعیف کام لیتا
ہے۔ لیکن اُس کی قوت مدرکہ باطنیہ حالت بیداری کے مقابلہ میں بہت
زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔ اور حدتِ احساس و ذکاوتِ ادراک کا پرتو اس
کے قوائے مخفیہ پر کسی ان دیکھی اور ان بوجھی روشنی کے وہ جلوے بکھیرتا ہے
جو ان آنکھوں نے نہ دیکھے تھے۔ اُس کے نفس ناطقہ کی عقلی اڑان بہت بلند
ہو جاتی ہے۔ صاحب توجہ کے ساتھ اُس کا روحانی تعلق بہت ہی گہرا ہو جاتا
ہے۔ اور جب توجہات کے اس سلسلے میں تعامل کی کثرت شامل ہو جاتی ہے
تو معمول کے تاثرات کا اشتداد اور اُن کے محیر العقول نتائج کا تنوع اور
بھی زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔

مسمریزم کی ان خصوصیات عمومی سے کسی کو انکار نہ ہوگا۔ اور ان
کے لئے کوئی منطقی ثبوت پیش کرنا محض تحصیل حاصل ہے۔ آج کل کی دُنیا
ذہنیات و روحانیات میں اس حد تک ترقی کر چکی ہے۔ کہ ناظرین کا وقت

مَیں ایسی لاطائل بحث میں پڑ کر ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ اس تحریر سے میرا مقصد کچھ اور ہی ہے۔ دنیا خواہ میری باتوں کو کیسا ہی بے سر و پا خیال کیوں نہ کرے لیکن مَیں نے اپنے جی میں ٹھان لی ہے۔ کہ ایک نہایت ہی عجیب و غریب مکالمہ کو اپنی طرف سے کسی حاشیہ آرائی کے بغیر من و عن سپردِ قلم کر کے ہی رہُونگا۔ جو میرے اور ایک سوتے جاگتے کے درمیان کچھ دِن ہُوئے واقع ہوُا تھا۔

مجھے مسمریزم کا فن اچھی طرح آتا ہے۔ ایک صاحب جن کا نام مسٹر ڈینکرک تھا۔ میرے معمول تھے۔ جو بے حد ذکی الحس واقع ہُوئے تھے۔ ایک مدّت سے وہ میرے زیرِ مشق تھے۔ اور حسب معمول میری توجہات نے ان میں "علو ادراک" کی وُہ بصیرت افروز خاصیت پیدا کر دی تھی۔ جو مسمریزم کے معمولین کا خاصہ ہے۔ بے چارے کئی مہینے سے سِل کے مرض میں مبتلا تھے اور مرض آخری درجے میں پہنچ چکا تھا۔ مرض کی تکلیف جب بہت ہی بڑھ جاتی تھی۔ تو وہ مجھے بُلا بھیجتے تھے۔ مَیں عقدِ انامل سے انہیں سُلا دیتا تھا۔ اور مسمریزم کی نیند کے آتے ہی مریض کا درد و کرب جاتا رہتا تھا۔ ماہ رواں کی پندرھویں تاریخ تھی اور چہارشنبہ کی شب تھی۔ کہ مسٹر ڈینکرک کا ملازم بے تحاشا بھاگتا ہُوا آیا۔ اور رونی صورت بنا کر کہنے لگا۔ کہ میاں تو دم توڑ رہے ہیں۔ چلیئے آخری بار اُن کا منہ دیکھ لیجیئے۔ مَیں نے اوورکوٹ پہنا۔ اور لکڑی ہاتھ میں لے کے افتاں و خیزاں مریض کے مکان پر پہنچا۔

مریض بستر پر پڑا درد سے کراہ رہا تھا۔ حوالیِ قلب میں رہ رہ کے

ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ اور سانس رُک رُک کے آ رہی تھی۔ اسی قسم کی علامات جب مریض پر پہلے طاری ہوتی تھیں۔ تو مراکزِ اعصاب پر رائی کا پلستر لگانے سے اُسے افاقہ ہو جایا کرتا تھا۔ لیکن آج رات یہ علاج بھی بےسُود ثابت ہوُا۔

مَیں جب کمرہ میں داخل ہوُا۔ تو مسٹر ڈینکرک نے کوشش کی۔ کہ حسبِ معمول میرا بہ خندہ پیشانی خیر مقدم کریں۔ لیکن فرطِ نقاہت اور شدّتِ کرب نے اس کوشش کو بہت زیادہ کامیاب نہ ہونے دیا۔ پھر بھی یہ ایک عجیب بات تھی۔ کہ جسمانی تکلیف کے باوجود اُن کی دماغی و ذہنی حالت بہُت اچھی تھی۔ اور اُن کا قلب مطمئن تھا۔ میرے آنے کے بعد یہ اطمینان بہت کچھ بڑھ گیا۔ درد میں کسی قدر افاقہ ہو گیا اور اُنہوں نے مجھے اس طرح خطاب کیا:۔

مَیں نے آج رات آپ کو محض اس لئے تکلیف نہیں دی۔ کہ آپ میرے جسمانی درد کی دوا کریں۔ بلکہ مقصد اس تکلیف دہی کا صرف اسقدر تھا کہ کچھ مدّت سے بعض رُوحانی کیفیات مجھ پر ایسی طاری ہو رہی ہیں کہ مَیں بہُت ہی مشوش و متحیر ہو گیا ہُوں۔ میں چاہتا ہُوں کہ آپ میری راہ نمائی کریں۔ اَور کسی طرح مجھے اس گرداب تشویش سے نکالیں۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے۔ کہ اب تک مَیں مسئلہ بقائے رُوح کو بہ نگاہ شک دیکھتا رہا ہُوں۔ اس سے تو مجھے انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ خود اس رُوح کے اندر بھی جس کا میں منکر بنا رہا ہوُں۔ ایک ایسی نیم ادراکی واردات پائی جاتی ہے۔ جو خود اس کے وجُود پر شاہد ہے۔ مگر یہ نیم ادراکی واردات بھی کبھی پایہ یقین کو نہیں پہنچی۔ میری عقل کو اس سے کچھ

سرو کار نہ تھا۔ اور استدلال و استنباط یہاں بے کار تھا۔ میں نے جب کبھی
ازروئے منطق کسی نتیجہ پر پہنچنا چاہا۔ تو شک کی دلدل میں میں پہلے سے بھی
زیادہ پھنس کے رہ گیا۔ مدت ہائے دراز کے غور و فکر کے بعد مجھے معلوم ہوا
کہ اگر کوئی شخص ازروئے عقل سلیم اپنے باقی اور غیر فانی ہونے کے متعلق کوئی
یقینی معلومات حاصل کرنا چاہتا ہو۔ تو محض ان مجردات تنزیہی کی وساطت
سے جن پر انگلستان۔ فرانس اور جرمنی کے اخلاق آموز فلاسفر آئے دن
دھواں دھار مضامین سپرد قلم کیا کرتے ہیں۔ وہ کبھی درجہ یقین نہیں حاصل
کر سکتے۔ مجردات عقلی۔ دماغی تفریحی اور ذہنی ورزش کے لئے تو بڑی اچھی
چیزیں ہیں لیکن دل انہیں نہیں مانتا۔ کسی دوسری دنیا کا عالم کچھ اور ہو تو ہو لیکن
یہ کرہ زمین جس پر ہم بستے ہیں۔ کم از کم اس میں تو فلسفہ ہمیں ہرگز یہ بات نہ منوا
سکیگا۔ کہ شے کی صفت عین شے ہے۔ یعنی ہمیں صفات ہی پر اس حیثیت سے
نظر ڈالنی چاہیئے کہ وہ اشیاء ہیں۔ خواہش ایک جداگانہ بات ہے ممکن ہے
کہ ہمارا جی چاہے۔ تو صفات کو اشیاء مان لیں۔ لیکن روح کبھی نہ مانے گی
عقل کبھی نہ مانے گی۔ نفس ناطقہ کبھی نہ مانیگا۔

یقین مانئے کہ حقیقت بقائے روح کی اس ادھیڑ بن میں مجھے صلیبت
کا رہ رہ کے کچھ احساس تو ہوا۔ اور وہ بھی نا تمام سا۔ لیکن عقلاً مجھے یہ بات کبھی
باور نہ آئی۔ البتہ گذشتہ چند دنوں سے میری واردات قلبی میں ایک خاص قسم
کا اشتداد پیدا ہونے لگا ہے۔ اور یہ اشتداد بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ گیا
ہے۔ کہ یہ میرا نیم احساس کامل اور یہ کامل احساس ادراک میں منضم ہو گیا اور

میرے لئے اِن دونوں میں کوئی فرق باقی نہیں رہا۔ اپنے قوائے اندرونی کی اس کیفیت کا جب میں سراغ لگاتا ہوں تو مجھے یہ بھی صاف نظر آتا ہے کہ کیفیت مسمریزم کے تاثرات کا نتیجہ ہے۔ شاید میں نے اپنے مفہوم کو واضح نہیں کیا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جب مجھ پر مسمریزم کا عمل ہوتا ہے۔ اور میرے قوے روبصعود ہوتے ہیں۔ تو میرے پیش نظر استدلال عقلی کا ایک ایسا نورانی عالم ہو جاتا ہے۔ جو بیہوشی میں تو ظنیات کو یقینیات سے بدل دیتا ہے لیکن بیداری میں صرف اثرات باقی رہ جاتے ہیں۔ جب میں سوتی جاگتی حالت میں ہوتا ہوں تو استقرا اور اس کا نتیجہ یعنی علت اور معمول ایک ساتھ موجود ہوتے ہیں لیکن طبیعی حالت میں علت غائب ہو جاتی ہے۔ صرف معلول باقی رہ جاتا ہے اور وہ بھی شاید کاملاً نہیں بلکہ جزءً۔

ان تمام مراتب پر غور کرتے کرتے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ کہ اگر مسمریزم کی نیند کی حالت میں مجھ سے پُر مغز سوالات کئے جائیں تو عجب نہیں کہ میرے جوابات نئی نئی حقیقتوں کے کاشف ہوں۔ اور جو حقیقتیں اب تک پوشیدہ ہیں اُن کے چہرے سے نقاب اُٹھ جائے۔

آپ نے اکثر دیکھا ہوگا۔ کہ جو لوگ نیند میں چلا کرتے ہیں۔ انہیں باوجود خوابیدگی کے بھی اپنی ہستی کا نہایت گہرا احساس ہوتا ہے۔ اور ان تمام مراتب کا جو مسمریزم کی حالت سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہیں نہایت وسیع علم ہوتا ہے۔ آپ اس خود شناسی کی پُراسرار کیفیت کو پیش نظر رکھ کر مجھے سُلا دیجئے اور سوالات کر دیکھئے۔ کیا عجب ہے کہ انکشاف حقائق عجیبہ کا یہی

ایک ذریعہ ہو جائے۔

میں خود ان دقیق مسائل میں بہت دلچسپی لیتا ہوں۔ مسٹر وینکرک نے جو بات سمجھائی تھی۔ وہ میرے دل میں بیٹھ گئی۔ ہات کی چند ہی برق آلود جنبشوں میں مَیں نے انہیں سُلا دیا۔ ان کا تنفس آسان ہو گیا اور جسمانی بے چینی کے تمام آثار غائب ہو گئے۔ اس کے بعد مجھ میں اور سونے والے میں ذیل کے سوال و جواب ہوئے۔ مکالمہ میں "وہ" سے مراد مسٹر وینکرک ہیں اور "میں" سے خود میں۔

میں:۔ کیا نیند آ گئی۔

وہ۔ ہاں۔ نہیں۔ نہیں۔ ابھی صرف اونگھ رہا ہوں۔ اور گہری نیند سو جانا چاہتا ہوں۔

میں۔ (ہات کی چند اور جنبشوں کے بعد) اب تو سو گئے؟

وہ۔ ہاں۔

میں۔ بھلا یہ تو بتاؤ۔ کہ تمہارے اس موجودہ مرض کا کیا انجام ہو گا؟

وہ۔ (بہت کچھ تامل کے بعد اور اس انداز سے کہ گویا بات کرنی بڑی مشکل ہے) میرے لئے مرنا ضرور ہے۔

میں۔ کیا موت کے خیال سے تمہیں صدمہ تو نہیں ہوتا؟

وہ۔ (با آمادگی تمام) نہیں۔ ہرگز نہیں۔

میں۔ کیا اس خیال سے تم خوش ہو؟

وہ - اگر میں عالمِ بیداری میں ہوتا۔ تو موت کی تمنا کرتا۔ لیکن اس وقت میرے لئے مرنا جینا برابر ہے۔ مسمریزم کی یہ حالت موت سے کچھ ایسی ملتی جلتی واقع ہوئی ہے۔ کہ اس حالت پر میں بالکل قانع ہوں۔

مَیں - آپ کا مطلب اچھی طرح نہیں سمجھا۔ براہ کرم اپنے قول کی شرح فرما دیجئے۔

وہ - امتثالِ امر میں مجھے عذر نہیں۔ لیکن اس وقت بات کرتے ہوئے مجھے اپنی رُوح پر اپنی سکت سے زیادہ زور ڈالنا پڑتا ہے۔ آپ اپنے سوالات مناسب پیرایہ میں کیوں نہیں کرتے؟

مَیں - آپ ہی فرمائیے۔ کیا سوال کروں؟

وہ - ابتداء مبدء سے کیجئے۔

مَیں - مبدء کیسا اور کہاں؟

وہ - (دھیمی آواز میں ایک خاص اتار چڑھاؤ کے ساتھ غایت عبودیت و تکریم کا اظہار کرتے ہوئے) آپ بھی جانتے ہیں کہ مبدء خدا ہے۔

مَیں - مگر خدا کیا ہے؟

وہ - (چند لمحوں تک متذبذب رہ کر) میں نہیں بتا سکتا۔

مَیں - کیا خدا رُوح تو نہیں؟

وہ - جاگتے میں مجھے معلوم تھا کہ رُوح سے آپ کی کیا مراد ہے۔ مگر اب تو اس کی حقیقت ایک لفظ سے بڑھ کر نہیں۔ صداقت اور حسن بھی دو لفظ ہیں۔ اسی طرح رُوح بھی ایک لفظ ہے۔ یُوں سمجھئے کہ یہ ایک

صفت ہے۔

مَیں - خدا غیر مادّی تو نہیں۔

وُہ - غیر مادیّت کا کہیں کوئی وجُود نہیں۔ یہ بھی محض ایک لفظ ہے۔ جو شے مادہ نہیں ہے۔ وہ سراپا نیستی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ صفات کو اشیاء سمجھ لیا جائے۔

مَیں - پھر کیا خُدا کا وجُود مادّی ہے؟

وُہ - نہیں۔

(اس جواب نے مجھے بہت ہی چونکا دیا)

میں - تو پھر وہ کیا ہے؟

وُہ - (ایک دراز وقفہ کے بعد گنگناتے ہوئے) - مَیں سمجھا - مگر یہ بڑا ٹیڑھا سوال ہے - جواب دُوں تو کن لفظوں میں (پھر دیر تک خاموش رہ کر) وُہ رُوح نہیں۔ کیونکہ وہ موجُود ہے۔ وہ مادہ بھی نہیں۔ جن معنوں میں آپ اس لفظ کو مادہ کہتے ہیں۔ البتہ مادہ کے متعدد مدارج ہیں جن کا حال انسان کو کچھ معلوم نہیں۔ ثقیل اور خفیف دو درجے ہیں۔ ثقل خفت پر دباؤ ڈالتا ہے۔ خفت ثقل میں سرایت کرتی ہے۔ مثلاً کرہ ہوا جوہر برق کو تحریک میں لاتا ہے! اور جوہر برق کرہ ہوا میں نفوذ کر جاتا ہے۔ مادہ کے یہ مدارج لطافت یا نزاکت میں ترقی کرتے جاتے ہیں۔ تاآں کہ مادہ کی حالت غیر ذرّاتی رہ جاتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر اس میں اجزائے دمقناطیسی جن کا دُوسرا نام اجزائے لاینجزیٰ ہے باقی نہیں رہتے اور وُہ مرتبۂ توحید و تفرید تک پہنچ جاتا ہے۔ یہاں پہنچکر دباؤ اور نفاذ

کا قانون بدل جاتا ہے۔ مادہ کی انتہائی یا غیر ذرّاتی حالت نہ صرف یہ کہ تمام اشیاء میں ساری ہو جاتی ہے۔ بلکہ تمام موجودات کی وجہ تحریک بن جاتی ہے۔ اس طور پر گویا کُل کائنات اس کے اندر سما جاتی ہے۔ یہی مادہ خدا ہے۔ انسان جس شئے کو عالمِ خیال کہتے ہیں وہ یہی مادہ ہے۔ مگر بصورت متحرک۔

مَیں۔ علمائے مابعد الطبیعۃ کا دعویٰ ہے کہ ہر عمل تحرک اور تخیّل میں تحویل ہو سکتا ہے۔ اور تخیّل ہی مبدء تحرک ہے۔

وُہ۔ آپ کا خیال صحیح ہے۔ اس خلط مبحث کا راز مجھ پر اب کھلا ہے۔ حرکتِ نفس ناطقہ کے عمل کا نام ہے تخیّل کے عمل کا نتیجہ نہیں ہے غیر ذرّاتی مادہ یا خدا ہی بحالت سکون جہاں تک کہ ہمارے تصوّر کو رسائی ہو سکتی ہے۔ وہ حقیقت ہے جسے انسان نفس ناطقہ کہتے ہیں۔ حرکت خود اختیاری کی استعداد جو دُوسرے لفظوں میں گویا انسان کی قوت ارادی ہے غیر ذرّاتی مادہ کے اندر اُس کی وحدۃ اور ہمہ گیر حلول کا نتیجہ ہے۔ اگرچہ مَیں یہ نہیں جانتا کہ ایسا کیوں ہے۔ اور اب مجھے صاف نظر آرہا ہے۔ کہ یہ بھید مجھ پر کبھی کھُلنے نہ پائیگا۔ لیکن اس قدر ضرور کہہ سکتا ہوں۔ کہ غیر ذرّاتی مادہ ایک ایسے قانون یا صنعت کی وجہ سے حرکت میں آنے کے بعد جو خود اس کے اندر موجود ہے۔ تخیّل بن جاتا ہے۔

مَیں۔ آپ نے اپنی تقریر میں غیر ذرّاتی مادّہ کا لفظ بار بار استعمال کیا ہے کیا آپ مجھے ذرا زیادہ وضاحت کے ساتھ بتا سکتے ہیں۔ کہ اس لفظ سے آپ کی کیا مُراد ہے؟

وُہ۔ جن مادی اشیاء کا انسان کو ادراک ہوتا ہے۔ وہ مختلف مدارج میں تحویل ہونے کے بعد اُس کی رسائی سے باہر نکل جاتی ہیں مثلاً دھات کا ایک ٹکڑا ہے۔ لکڑی کا ایک کندہ ہے۔ پانی کا ایک قطرہ ہے۔ کرہ ہوا ہے غاز ہے۔ برق ہے۔ منوّر ایتھر ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ان تمام اشیاء کو ہم مادہ ہی کہتے ہیں۔ اور ان سب پر ایک عام تعریف صادق آتی ہے۔ جو من حیث المجموع مادہ کا لقب عمومی ہے۔ لیکن با ایں ہمہ کوئی سے دو خیالات بھی ایک دُوسرے سے اس درجہ متمائز و متفارق نہیں جیسے وُہ خیالات جو ہمارے ذہن میں دھات کے ایک ٹکڑے اور منوّر ایتھر کے تصوّر سے وابستہ ہیں۔ جب ثانی الذکر تصوّر ہمارے پیش نظر ہوتا ہے۔ تو کوئی چیز ہے جو بے اختیار ہم کو مجبور کرتی ہے کہ اسے مادہ نہ سمجھیں بلکہ رُوح بلکہ نیستی کے زمرہ میں شامل کر دیں۔ اگر ہم ایسا نہیں کرتے۔ تو اس کی وجہ صرف اسی قدر ہے کہ ہم ایتھر کو اجزائے لاینتجزی سے۔ کہ ان کا ایک سادہ تر نام سالمات بھی ہے مرکّب سمجھتے ہیں۔ اور ادراک کی اس منزل میں بھی ہمیں اپنے اُس تصوّر سے مدد لینی پڑتی ہے۔ جو ہم نے ایک سالمہ کے بارے میں قائم کر رکھا ہے۔ کہ اس میں چھوٹے اور ٹھوس اور محسوس اور وزنی ہونے کی بے پایاں صفات جمع ہیں۔ ترکیب سالمی کے تصوّر کو اگر ہم فنا کر دیں۔ تو پھر ہم ہرگز اس بات کو خیال میں نہ لا سکیں گے۔ کہ ایتھر کی بھی کوئی ہستی ہے یا کم از کم اس پر مادہ کا بھی اطلاق ہو سکتا ہے۔ اور جب اللہ کی تعریف کے لئے ہمارے پاس کوئی موزوں تر لفظ موجود نہیں ہے۔ تو پھر کیوں نہ ہم اس

کو رُوح ہی کہیں۔ اب خیال کا ایک اور قدم آگے بڑھائیے۔ اور مندرا ایتھر کے طبقہ سے گزر کر ایک ایسے مادہ کا تصوّر اپنے ذہن میں قائم کیجئے۔ جو ایتھرا سے بھی زیادہ لطیف ہے۔ پھر باوجود فلسفیوں کی قیل وقال کے آپ ایک ایسے اچھوتے وجود سے دوچار ہوں گے۔ جسے غیر سالمی مادہ کہا جاسکیگا۔ اس لِئے کہ خواہ ہم خود سالموں کے اندر غیر محدود چھوٹائی کا ہونا تسلیم کر ہی لیں لیکن سالموں کے اندرونی تخلخل میں جو جوف ہوں گے۔ اُن کی چھوٹائی کی بے پایانی ایک بالکل مُہمل اور بے معنی سی بات ہے۔ اگر سالمات کا شمار کافی ہو تو ایک نقطہ موہوم ایسا ضرور رہ جائیگا۔ اور لطافت کا ایک درجہ یقیناً ایسا آجائیگا۔ جہاں تخلخل کے جوف کا نابود ہو جانا اور تکاثف مطلق کا پیدا ہو جانا لازمی ہے۔ لیکن اب چونکہ ترکیب سالمی کا اعتبار اُٹھ گیا ہے۔ اسلئے مادہ کے وجود کی نوعیت کا استحالہ خود بخود اُس شے میں ہو جاتا ہے جسے ہم رُوح سمجھتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ رُوح بھی وہی مادہ ہے۔ جس پر ہم بحث کرتے چلے آرہے ہیں۔ اور سو بات کی ایک بات تو یہ ہے۔ کہ رُوح کا تصوّر خارج از امکان ہے۔ اس لئے کہ جس چیز کا کوئی وجود ہی نہ ہو وہ ذہن میں کس طرح آسکتی ہے۔ جب ہم یہ کہہ کر اپنا دِل خوش کر لیا کرتے ہیں کہ رُوح کا تصوّر ہم نے اپنے ذہن میں قائم کر لیا ہے۔ تو ہم گویا اپنی عقل کو دھوکا دیتے ہیں۔ ہمارے ذہن میں جس شے کا تصوّر آیا تھا وہ رُوح کا نہ تھا۔ بلکہ بے انتہا لطیف مادہ کا تھا ؎

———✕———